سلسلۂ اشاعت الامان دہلی
نمبر ۹
فن مضمون نگاری
از
فہیم الدین نوری
در مطبع الامان دہلی طبع گردید
قیمت مجلد
(۱۲؍)

شیردل خاتون

یعنے

دور فاروقی کا تاریخی افسانہ

یہ جناب مولانا محمد مظہر الدین صاحب مالک اخبار الامان کی وہ نثر پا دینے والی تصنیف ہے جس کی وجہ سے الامان کی اشاعت میں تقریباً ایک ہزار خریداران کا اضافہ ہوگیا ہے جو شخص ایک حصہ پڑھ لیتا ہے دوسرے کے لیئے بے چین رہتا ہے حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ کا نقشہ اور فتوحات اسلامی کی روائی صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سر فروشانہ جدوجہد کا نظارہ

حسن و عشق کی سچی داستان

پڑھنا ہو تو اس کتاب کو ضرور طلب کریں یہ کتاب مسلم خواتین کے لیئے درس حیات ہے ایک طرف سیف اسلام حضرت خالدؓ اور غازی شام حضرت ابو عبیدہؓ نیز ایک غازیہ حضرت خولہ اور

پراسرار جنگی سوار

کے معرکے مسلمانوں میں اسلام کی سچی روح پھونک دیتے ہیں تو دوسری طرف شہزادی جوزیفائن کے عشق و حسن کی داستان دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔ یہ کتاب اسلامی روایات کی حیات تازہ ہے۔ قیمت حصہ اول فی جلد عہ ر علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ:- الامان بکڈپو گلی قاسم جان دہلی۔

(حصۂ اول)

از

فہیم الدین نوری

(بیچلر آف ٹیچنگ، ٹیچرس ڈپلوما ان انگلش)

سابق اسسٹنٹ ماسٹر۔ اسلامیہ ہائی سکول، بریلی

سابق ایڈیٹر، میونسپل میگزین، روہیلکھنڈ گزٹ

حال اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ جریدۂ الامان، دہلی

— ملنے کا پتہ —

الامان بک ڈپو۔ گلی قاسم جان دہلی

میں ان اوراق کو محقق و مجتہد زبان اُردو

حضرت مولانا مولوی وحیدالدین سلیمؒ

کے نام سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں کہ ان کی محبت
شفقت، توجہ اور فیض صحبت نے میری علمی، ادبی زندگی کو بنایا
اور سنوارا ہے۔

خاکسار

فہیم الدین نوری

(شاگرد حضرت سلیم مرحوم)

میرے عزیز دوست مسٹر واحد حسین صاحب رضوان بریلوی نے فرمائش کی کہ "فن مضمون نگاری" پر ایک ایسا مضمون لکھو جس میں اس فن کے بنیادی اصول اجمالاً زیرِ بحث آجائیں۔ لہٰذا ان کی فرمائش اور پیہم اصرار پر میں نے اپنے خیالاتِ پریشان جو میں اردو مضمون نگاری کے متعلق رکھتا تھا، ایک مختصر مضمون کی صورت میں منضبط کر دیئے لیکن بعد کو یہ رائے قایم ہوئی کہ یہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ تاکہ وہ لوگ جو اردو میں مضمون لکھنے کی ابتداء کرنی چاہتے ہوں۔ اس سے تھوڑا بہت فائدہ حاصل کر سکیں۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھکر میں نے اصل مضمون میں ضروری ترمیمیں اور اضافے کر دیئے۔

مجھے اس امر کا اقرار ہے کہ یہ کتاب فن مضمون نگاری پر کوئی مکمل کتاب نہیں ہے لیکن غالباً یہ امید باندھنی بے جا نہ ہوگی کہ مبتدیوں کو اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوگا۔

اگر ایسا ہوا تو میں یہ سمجھوں گا کہ یہ کتاب از حد کامیاب ہوئی۔

دہلی ۱۱ / جولائی ۱۹۲۹ء

(فہیم الدین نوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فن مضمون نگاری

مضمون کی تعریف اور اسکی قسمیں

سمجھانے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی چیز، واقعہ یا بات کے متعلق جو کچھ معلوم ہو اُس کی روشنی میں اس چیز یا واقعہ یا بات کے مختلف پہلوؤں پر تحریر کے ذریعے سے اظہار خیال کئے جانے کو مضمون کہتے ہیں۔

مضمون کی قسمیں یہ ہیں:۔

(۱) توضیحی (۲) داستانی (۳) توضیحی داستانی (۴) تاریخی (۵) ذہنی (۶) تنقیدی

(۱) **توضیحی مضمون**: وہ ہوتا ہے جس میں کسی چیز یعنی مکان، جہاز، طیارہ یا اسی طرح کی اور کسی چیز پر روشنی ڈالی گئی ہو اور اس کی وضاحت کی گئی ہو۔ اس کی ایک مثال درج ذیل کیجاتی ہے۔

سکہ

۱۔ دھات کے ایسے ہم وزن ٹکڑے جن پر کسی فرمانروا یا بادشاہ کے نام

کا ٹھپہ ہوتا ہے سکے کہلاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ملک میں پائی، دھیلا، پیسہ، ادھنا تانبے کے سکے ہیں۔ اکنی، دونی دوانی اور بڑی چونی کئی دھاتوں کے مجموعہ کے۔ اور چھوٹی دوانی اور چھوٹی چونی اور اٹھنی اور روپیہ چاندی کے اور اشرفیاں سونے کے سکے ہوتے ہیں۔

۲۔ فرمانروا یا بادشاہ کے نام کا ٹھپہ اس بات کی سند اور ضمانت ہوتی ہے کہ سکہ کھری دھات کا ہے اور جو وزن اس کا حکومت نے مقرر کیا ہے وہ سکہ اس میں پورا ہے۔ جو لوگ کھوٹے سکے بناتے یا چلاتے ہیں وہ حکومت کی طرف سے سخت سزائیں پاتے ہیں۔

۳۔ جب تک سکے کا رواج نہ ہوا تھا اس وقت تک چیزوں سے چیزوں کا تبادلہ ہوتا تھا جس طرح گاؤں اور قصبوں میں ضرورت کے وقت آج بھی ہوتا ہے۔ غلہ دیکر ترکاری حاصل کرتے ہیں کپاس کے بدلے گھی لیتیں اور نمک لے آتے ہیں۔

۴۔ بغیر سکے کے روزمرہ کے چھوٹے موٹے لین دین تو ہو سکتے ہیں۔ مگر بڑی تجارتوں کا چلنا ممکن نہیں۔ خاصکر جہاں طرح طرح کے پیشے ہوتے ہیں وہاں سکے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

۵۔ اگر سکے کا چلن نہ رہے تو تم خیال کر سکتے ہو کہ حکومت کے خزانے میں بجائے روپئوں اور توڑوں کے کیا ہو۔ ہر قسم کا غلہ، میوے، ترکاریاں، ہر جنس کے چوپائے، ہر طرح کا اسباب

اور کاٹھ کباڑ محصول کے طور پر جمع ہوا کرے، اور وہی سب سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں تقسیم ہوا کرے۔

۶۔ اگر سکہ نہ ہوتا تو ایک من گیہوں یا چند سیر گھی خریدنے کے واسطے اُپلوں کا مالک پوری دو گاڑیاں بھر کر منڈی لیجایا کرتا اور اوران کے بدلے میں دس بیس سیر گیہوں یا سیر آدھ سیر گھی حاصل کرتا۔ اسی طرح بڑے بڑے حاکموں اور افسروں کو اُن کو تنخواہ کے طور پر غلہ اور اسباب دیا جاتا۔

اب ذرا سوچو کہ اس کے رکھنے کو ان کے مکانات بھلا کس حد تک کافی ہوتے۔

۷۔ سکے سے تجارت اور لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہے ہر شخص اپنی محنت یا اپنے مال کے عوض میں سکے لیتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنی خواہش اور ضرورت کے موافق ہر چیز خرید سکتا ہے

۸۔ دھات ہر ایک چیز سے زیادہ مضبوط اور وزنی ہوتی ہے وزنی ہم اُس چیز کو کہتے ہیں جو جگہ کم گھیرتی ہے۔ تمام دھاتوں میں تانبا، چاندی اور سونا بہت اچھے ہیں، اسی واسطے ان کے سکے بنائے جاتے ہیں

۳۔ **داستانی مضمون** سے وہ مضمون مراد ہے جس میں کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً جو مضامین کسی سفر، کسی فساد، یا اسی طرح کے کسی اور

واقعہ سے متعلق لکھے جائیں گے وہ سب داستانی ہوں گے۔ داستانی مضمون کی ایک مثال درج ذیل ہے

ایک لالچی بندر کا انجام

۱۔ کوئی شکاری ایک تنگ موہنہ کے برتن میں تھوڑی مٹھائی ڈال کر چپکے سے جنگل میں رکھ آیا۔ ایک لالچی بندر نے اس کو دیکھا۔ پاس جو گیا تو برتن کے اندر مٹھائی نظر آئی۔ فوراً برتن کے موہنہ میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور مٹھی بھر کر مٹھائی نکالنی چاہی لیکن اب بندھی ہوئی مٹھی نکلتی تو کیونکر نکلتی۔ نہ برتن کا موہنہ کشادہ ہو سکتا تھا۔ نہ وہ بندھی مٹھی کھولتا تھا۔ اس کو نہ طمع اجازت دیتی تھی، نہ عقل اُس کی رہنمائی کرتی تھی۔ کہ مٹھائی سے دست بردار ہوتا اور اپنی جان بچاتا۔

۲۔ آخر کار شکاری آیا اور اس نے بندر کو گرفتار کر لیا۔ بعینہ یہ مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو مال کی محبت میں اس قدر مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایک دن میں دنیا کی دولت کو سمیٹ کر اپنے تئیں قارون ثانی بنا لینا چاہتے ہیں لیکن اس طمع پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبتوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں جس سے ان کی جان چھڑائے نہیں چھوٹتی۔

۳۔ **توضیحی داستانی مضمون**۔ اُسے کہتے ہیں جس میں کسی ایک چیز یا بہت سی

چیزوں کی وضاحت کی گئی ہو اور اسی کے ساتھ کسی ایک واقعہ یا کئی واقعات کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہوں ۔ مثلاً اگر تم نے دہلی سے بمبئی تک کا سفر کیا اور اس کے متعلق کوئی مضمون لکھا تو وہ اسی قسم کا ہوگا ۔ کیونکہ کہیں تو تم مناظر فطرت، یا کسی اسٹیشن یا کسی عمارت یا کسی اور چیز کی وضاحت کروگے اور کہیں بعض واقعات کی داستان بیان کروگے ۔ مندرجہ ذیل مثال کو غور سے پڑھو ۔

مسٹر فیشن ایبل اور ان کا کچا چٹھا

۱ ۔ ذرا ان کو دیکھنا! کس اکڑ تکڑ سے چلے آتے ہیں، جیسے کسی فرسٹ کلاس کالج کا پروفیسر یا کوئی کامیاب وکیل یا اعلیٰ درجہ کا بیرسٹر ۔ ان کے ٹھاٹ باٹ بھی ملاحظہ ہوں ۔ ایک عمدہ سوٹ پہنے ہیں پتلون کی چوڑی مہری ایڑی پر لوٹ رہی ہے ۔ ٹائی کا چوڑا سرا ہوا میں اڑ رہا ہے ۔ عینک بھی لگی ہے ۔ نرم ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہیں، پھندنے کو سر کی حرکت سے اچھالتے، چھڑی ہلاتے چلے آتے ہیں ۔

۲ ۔ لیکن بجائے شکل و صورت اور ذاتی لیاقت کو کیا کریں کہ یہ صوری و معنوی جوہر ان سے کوسوں دور ہیں ۔ صورت دیکھ لیجیے کہ آنکھ ناک، رنگ، روپ اور خط و خال کو دیکھ کر طبیعت میں کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے ۔ لیاقت کا حال سن لیجیے کہ ایک دفعہ اسی شان سے بازار میں ٹہل رہے تھے

کسی نے آپ کو انگریزی داں سمجھکر ہاتھ میں ایک تار تھما دیا کہ ذرا اسے پڑھ دیجئے۔ پڑھ تو چکا ہوں، لیکن مطلب صاف سمجھ میں نہیں آیا۔"

پہلے پہل تو آپ دو تین لمحہ تک کچھ پریشان نظر آئے۔ لیکن اس کے فوراً بعد تار کو زمین پر پٹک کر بولے کہ بڑے بدتمیز ہو راہ چلتے شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہو۔ ہمیں فرصت نہیں

۳۔ پیچھے پیچھے ایک کوئی لنگوٹیا یار بھی آ رہا تھا۔ وہ یہ تماشہ دیکھکر بولا کہ بھائی یہ تو آج اپنی عینک گھر بھول آئے ہیں جس کی معنی یہ تھے کہ علم کی تو انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

۴۔ یہ ہے ان صاحب کا کچا چٹھا۔ دیکھنا ظاہری ٹھاٹ باٹ دیکھکر کہیں دھوکہ میں آنا۔

۴۔ تاریخی مضمون تو اپنی تعریف خود ہی کر رہا ہے کہ جو مضامین تاریخی حالات و واقعات پر مشتمل ہوں گے وہ تاریخی ہوں گے۔ مثلاً پانی پت کی تیسری جنگ پر اگر کوئی مضمون لکھا جائے گا تو اس کی نوعیت تاریخی ہوگی۔ بشرطیکہ واقعات پر من مانی حاشیہ آرائی اور بے جا تصرف نہ کیا جائے اور مضمون کو داستان یا افسانہ کا باب نہ بنایا جائے اس قسم کے مضمونوں کی ایک مثال ذیل میں درج کیجاتی ہے۔

مہابھارت

ا۔ کتاب مہابھارت میں مرقوم ہے کہ زمانۂ قدیم میں راجہ

بھرت فرمان رواے ہستنا پور تھا۔ اُسی کے نام سے ہندوستان بھرت کھنڈ کہلاتا ہے۔ مدت دراز تک اُس کے خاندان نے سلطنت کی۔ اسی سلسلہ میں دھرت راسٹر اور پنڈ دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی نابینائی کے سبب سے محروم رہا اور چھوٹا سریر آرائے سلطنت ہوا۔ دھرت راسٹر کے ایک سے ایک بیٹے تھے۔ جن میں بڑا جر جودھن تھا۔ اور یہ گروہ کورو کا تھا۔ پنڈ کے پانچ فرزند تھے۔ جدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل سہدیو، اور یہ پانچوں پانڈوں کے لقب سے مشہور تھے۔

۲۔ جب پنڈ نے رحلت کی تو دھرت راشٹر جانشین ہوا۔ کچھ عرصہ میں پانڈوں بھی جوان ہوگئے اور علم و ہنر میں کمال حاصل کیا۔ چچا نے جدھشٹر کو ولی عہد بنایا۔ جر جودھن نے حسد کے مارے خودکشی کا ارادہ کیا۔ ناچار باپ نے نصف ملک اس کو دیدیا اور بھتیجوں کو اُن کی ماں سمیت شہر برناوہ میں بھیجنا مصلحت جانا۔ مگر جر جودھن کے بغض وعناد نے وہاں بھی ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اُن کے محل میں آگ لگائی گئی۔ مگر وہ ایک نقب کی راہ سے صحیح و سالم نکل گئے۔ اور زاہدانہ لباس میں صحرا نوردی اختیار کی۔

۳۔ قضارا ان کا گذر راجہ دروپد کے پائے تخت شہر کنپلہ میں ہوا۔ جہاں راجہ کی بیٹی کے سوئمبر کی دھوم دھام ہو رہی تھی

میدان میں ایک بلند لکڑی پر طلائی مچھلی نصب کی گئی تھی کہ جو ہنرمند اپنے تیر سے اس کو گرا دے۔ وہی دروپدی کے شوہر ہونے کا فخر حاصل کرے۔

۴۔ اگرچہ دور دور کے فرمانروا اور چھتر سُورما اس مجمع میں حاضر تھے لیکن ناکامی کے خوف سے کسی کو شرط کے بجا لانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ یہ پانچوں بھائی برہمنوں کی صف میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک ارجُن کی رگوں میں چھتری خون نے جوش مارا اور وہ صفوں کو چیر پھاڑ کر آگے بڑھا اور بھاری کمان کو اُٹھا تیراندازی کا ارادہ کیا۔ برہمنوں کے گروہ نے دہائی دی کہ خبردار او! نادان برہمن زادے ایسی دلیری نہ کر۔ مگر اس جوان مرد نے ایک ایسا تیر مارا کہ مچھلی گر پڑی اور گروہ خلق نے آفرین کا نعرہ بلند کیا۔

۵۔ الغرض بموجب شرط کے پانچوں بھائی نوعروس کو ساتھ لے کر اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے جب راجہ دروپد کو ان کی شرافت کا حال معلوم ہوا تو جو ملال اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا وہ بالکل رفع ہو گیا۔

۶۔ آخر کار یہ خبر ہستناپور میں پہونچی۔ دھرت راشٹر نے بھتیجوں کو طلب کیا اور نصف سلطنت اُن کو دیدی۔ شہر اندرپرست دارالحکومت قرار پایا۔ اور بڑا بھائی جدھشٹر مسند ریاست پر بیٹھا

اس طور سے کچھ مدت عیش و آرام کے ساتھ بسر ہوئی تھی کہ جرجودھن کے دل میں پھر کینۂ دیرینہ تازہ ہوا اُس نے جدھشٹر کو ہستناپور میں بُلا کر قمار بازی کی محفل آراستہ کی اور دغا سے اُس کا کُل ملک و مال جیت لیا۔

۷۔ انجام یہ ہوا کہ پانچوں بھائی مع دروپدی کے بارہ سال کے لیے جلا وطن کیے گئے۔ یہ میعاد ختم ہوئی تو پانڈوؤں نے اپنے ملک موروثی کی خواہش کی۔ جرجودھن نے صاف انکار کیا۔ تب انہوں نے کہا کہ صرف پانچ مقام کیتھل، کرنال، اندرپی، برناوہ، اور اندرپرست ہماری بسر اوقات کے لیے چھوڑ دے ورنہ ہم اپنا حق بزور شمشیر لیں گے۔

۸۔ جرجودھن نے صلح پر جنگ کو ترجیح دی اور اپنے رفیق راجاؤں کو اعانت کے واسطے طلب کیا۔ جدھشٹر نے بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں سے کمک چاہی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بیشمار لشکر طرفین کے معاونوں کا تھانیسر کے میدان میں آ کر جمع ہو گیا۔ ہندوستان کے گنی، گیانی، سورما، پہلوان، راجہ مہاراجہ سبھی اس معرکہ میں شریک ہوئے۔ کوئی کوروؤں کی طرف ہو کر داد شجاعت دیتا اور کوئی پانڈوؤں کی جانب سے جوہر مردانگی دکھاتا تھا۔ اٹھارہ روز تک ہنگامہ کارزار گرم رہا۔ بڑے بڑے نامی گرامی جنگ آور اور اہل فضل و ہنر کام آئے۔ انجام کار پانڈو

کو فتح و فیروزی نصیب ہوئی اور کوروں میدان جنگ میں قتل کئے گئے۔

۵۔ **ذہنی مضمون**۔ اس مضمون کو کہتے ہیں جس کی بنیاد فلسفیانہ خیالات پر ہو مثلاً ہمدردی نجاتی وغیرہ پر اگر کوئی مضمون لکھا جائے تو ہر مضمون نگار اپنے خیالات اور اپنے نقطۂ نظر کو دلائل و براہین سے صحیح ثابت کرنے اور منوانے کی کوشش کرے گا۔ میرے نزدیک جتنے مضامین کی بنیاد تخیل پر ہوگی وہ سب ذہنی مضامین کے تحت میں آجائیں گے۔ ذہنی مضمون کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

سچے دوست کا انتخاب

۱۔ جو شخص سچے دوست کا جویا ہو۔ اُس کو دوست کے انتخاب میں چند اُمور کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔

اوّل۔ یہ بات معلوم کرے کہ بچپن میں والدین کے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا۔ اگر اُس نے اُن کے حقوق تلف کئے ہوں تو ایسا شخص قابل اعتماد نہیں۔ اُس سے بھلائی کی توقع کرنا عبث ہے۔

دوم۔ دریافت کرے کہ اور دوستوں کے ساتھ اُس کا معاملہ کیسا ہے۔

سوم۔ یہ تحقیق کرے کہ وہ محسنوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔ اگر اُن کی شکر گذاری کا حق ادا نہ کیا ہو تو اُس کی طرف رغبت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ کفران نعمت انسان کے

خصائل میں سے نہایت کمینہ خصلت ہو۔
چہارم۔ اُس کا عام چال چلن اور اُس کی طبیعت کا میلان معلوم کرے۔ اگر وہ لالچی، طماع۔ بخیل، حریص، بدعہد۔ بیوفا بدمزاج ہو۔ تو ہرگز اُس کو قابل دوستی نہ سمجھے۔
پنجم۔ یہ معلوم کرے کہ اُس کی طبیعت میں عدل اور انصاف بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جو شخص اپنے حق سے زیادہ چاہے اور دوسروں کو دبائے اُس سے دوستی کا نباہ ممکن نہیں۔
ششم۔ یہ بات دیکھے کہ وہ اپنے شوق و رغبت کے مقابلہ میں دوستی کی پرواہ اور قدر کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ لہو ولعب میں زیادہ مصروف رہتا ہو۔ تو اس کی دوستی لاحاصل ہے۔

۲۔ الغرض جو آدمی خصائل مذکورہ کی جانچ میں کھرا نکلے اُس سے خلوص و اتحاد پیدا کرنا زیبا ہے۔ مگر یاد رہے کہ ایسا شخص جو بہمہ صفت موصوف ہو۔ شاذ و نادر ملتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایسا ایک دوست بھی مل جائے تو بس کافی ہے لیکن دوست میں جزوی عیب اور ادنیٰ تقصیر پاؤ تو اس پر چنداں لحاظ نکرو کیونکہ ان اُمور سے کوئی فرد بشر خالی نہیں۔ اگر تم فرشتہ خصلت دوست چاہو گے، جس میں کچھ کور کسر نہ ہو، تو مدت العمر اسی ڈھونڈ میں رہو گے، نہ کوئی ایسا ملے گا۔ نہ تم اُسکو

دوست بناؤ گے۔ انجام یہ ہوگا کہ تم دوستی کے فوائد سے محروم
رہو گے۔ اس کے متعلق آدمی کو خود اپنے نفس کے عیوب
ٹٹولنے چاہئیں اگر انصاف کرے گا تو دیکھے گا کہ وہ خود بھی
مبرا نہیں ہے۔ تو چاہیئے کہ دوسروں کو بھی ادنیٰ خطاؤں
میں معذور سمجھے۔

۶۔ **تنقیدی مضمون** وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے کسی چیز، واقعہ یا بات پر
تنقید اور تبصرہ کیا جاتا ہے یعنی جو کسی چیز واقعہ یا بات پر موافقانہ اور مخالفانہ روشنی
ڈالنے کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے مضمون کی تین مثالیں درج ذیل کی جاتی
ہیں جن میں کی ہر ایک اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ شان رکھتی ہے۔

غیر زبان کے لفظوں کا استعمال

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا
لطف بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔ کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور
نئے لفظوں کو اوس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین
کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی اُس
مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے۔ جو عظمت اُس کے مرادف
لفظ سے جو اُس زبان میں مستعمل ہے۔ دل میں نہیں بیٹھتی۔ مثلاً بعض
اہل زبان اپنی تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جس کی مناسبت
کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں **جنٹلمین** کا لفظ بولتے ہیں، اگر

وہ اُس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں۔ تو اُس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مِل جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں شریف کا لفظ ذلیل ہو گیا ہے۔ اُس سے بجز اس خیال کے کہ اُس کے حسب نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ یعنی شیخ سیّد مغل پٹھان ہے۔ اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اُس لفظ کا بولنے والا اُس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں جمانا چاہتا ہے۔ وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے۔ جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں، تعلیم میں، حیثیت میں، اطوار میں، افضل ہو۔ اُس کی تعلیم و تربیت اُس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو۔ وہ ہر بات میں جو اُس سے متعلق ہو حلیم ہو۔ چال چلن میں حوصلہ اور مزاج میں خواہشیں اور ارادے میں سلیم ہو۔ ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور پڑھنے لکھنے اور نیک صحبت میں بیٹھنا اُس کو پورا کرتا ہے۔ اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں۔ مگر چونکہ اُس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے۔ تو یہ پورا خیال اُس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔ پس ایک محب قوم اہل زبان اُن خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لئے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے۔ اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے۔ تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم

کے اور لفظوں کا بھی اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت
یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہو جائے۔ اسی نمونے سے ہمارے معترض
خیال کریں گے کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا
ہے۔ اور ان لغو خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت پر
مرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ بولتا ہے۔ اپنی واقفکاری انگریزی کی
جتاتا ہے۔ کیونکہ کسی جنٹلمین کو ایسے ذلیل خیالات کسی جنٹلمین کی
نسبت کرنے زیبا نہیں۔ (سر سید)(7)

اب دوسری مثال کا بہ غور مطالعہ کرو۔

جنرل نادر خان اور افغانستان کا مستقبل

ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ افغانستان موجودہ دور بہیمیت و ابتری
سے نکلکر از سر نو امن و نظم کی منزل تک پہونچیگا یا دشمنان افغانستان
کی ملوکیت پرستی کا شکار ہو جائیگا۔ افغانستان کے متعلق جو
خبریں مختلف ذرائع سے حال ہی میں موصول ہوئی ہیں ان سے
ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل غلام نبی خاں کے شمالی صوبے سے روانہ
ہونے اور گردیز کے دوبارہ مفتوح ہونے کے بعد بچہ سقہ نے
نئی زندگی حاصل کر لی ہے۔ اور اب وہ اپنی فتوحات پر خوشی
کے شادیانے بجا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ جنرل نادر خاں
اور ان کے بھائیوں کی حالت روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کمزور اور

مقیم ہو رہی ہو حتیٰ کہ ان کے ہندوستان پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے اگرچہ آج اس کے برعکس خبر آئی ہے۔

۳۔ بغاوت افغانستان کے سلسلہ میں دو تین باتیں بالکل واضح اور صاف ہیں۔ پہلی بات جو ایک مسلمہ واقعہ ہو چکا ہے کہ اس میں اب غیر ملکیوں کو پورا پورا دخل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امان اللہ خاں نے کابل کے شاہی خزانہ میں اتنی دولت ہرگز نہیں چھوڑی تھی جو بچہ سقہ کو اس وقت تک کام دیتی رہتی۔ بلکہ غازی امان اللہ خاں نے کابل کے خزانہ شاہی کو تو اسی دن خالی کر دیا تھا جس دن انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ علیہ حضرت اور ملکہ ثریا کو اس طیارے کے ذریعہ سے جو جرمنی نے ان کی خدمت میں بطور تحفہ کے پیش کیا تھا کابل سے قندھار بھیجا تھا۔ اور جس کے کچھ دنوں بعد انہوں نے کرنل لارنس کی گرفتاری کے لئے ایک معتدبہ رقم انعام کا اعلان کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بچہ سقہ نے کابل کے تجارت پیشہ اور مالدار باشندوں کو لوٹ کر اپنا خزانہ پر کر لیا تو یہ بات ہماری عقل اور سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کیسہ در افغان آج سے کئی ماہ پیشتر اس کی بوٹیاں بکھر چکے ہوتے۔ برخلاف اس کے زبردست افغان اس کی مٹھی میں ہیں اور بچہ سقہ کابل میں غیر ملکی بازیگروں کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہوتی جاتی ہے

کہ افغانستان کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی قدر غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہی۔ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ وہ گہرا حربہ جو بچہ سقہ نے سب سے پہلے امان اللہ خاں پر لگایا تھا اور جس سے شاہی فوج کی کمر ہمت و استقلال ٹوٹ گئی تھی یہ تھا کہ سقہ شاہی یا غی افغانی فوج کی سی وردیاں پہنکر شاہی سپاہ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ بچہ سقہ نے وردیاں کہاں سے اور کیونکر حاصل کی تھیں، آج بھی وہی ہاتھ کام کر رہا ہے کہ بچہ سقہ جیسا بے شعور شخص اپنے اعلانوں پر غازی امان اللہ خاں اور ملکہ ثریا کی تصویریں شائع کر رہا ہے۔ تیسری بات جو از حد رنجدہ اور دلخراش ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے امان اللہ خاں۔ عنایت اللہ خاں، علی احمد جان غلام نبی خاں کو کامیاب نہ ہونے دیا وہ نادار جنرل نادرخاں اور ان کے بھائیوں کو کامیابی سے کیونکر ہم آغوش ہونے دیں گے۔ لیکن اگر غازی جنرل نادرخاں ان مشکلات اور اور مایوس کن مواقع کے مقابلہ پر کامیاب ہو گئے تو ہم سمجھیں گے کہ نادرخاں محض اعلیٰ درجہ کے سپاہی اور ماہر فن جرنیل اور دانا و بینا مدبر ہی نہیں بلکہ ایک چھپے ہوئے دلی بھی ہیں۔

(الامان دہلی مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۲۹ء)

اب تیسری مثال درج ذیل کی جاتی ہے

فیہ ما فیہ

(یعنی ملفوظات مولانا جلال الدین رومی رح)

اس وقت ہندوستان میں تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ جاری ہے، عام طور پر اس کا مقصد صرف تصنیف و تالیف ہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ اور مقاصد بھی حاصل ہو جائیں لیکن یہ ایک ضمنی چیز ہے۔ خود مصنفین کا منتہائے نظر ملک کے سامنے ایک کتاب کے پیش کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن ہماری خوش قسمتی سے اب بعض بلند خیال مصنف ایسے پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک اصلی چیز، اصلاح خیال، اصلاح معاشرت اصلاح مذہب، تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس ہے اور اگر یہ مقصد تصنیف و تالیف سے حاصل ہو سکتا ہے تو وہ بجائے خود کوئی اہم مقصد نہیں بلکہ ان مقاصد عالیہ کی تکمیل کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ خود تصنیف و تالیف کو ایک ضمنی چیز سمجھتے ہیں، ورنہ ان کا اصلی مطمح نظر چند سفید صفحات کے سیاہ کر دینے کے بجائے چند سیہ کاروں کے دلوں کو جلا دینا اور روشن کرنا ہے۔

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست ؏ ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجا است

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان چند بلند خیال شخصیتوں میں سے
ہیں جنہوں نے مروجہ تصوف کی تہذیب و اصلاح کو اپنی زندگی کا
ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، اور اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے
ہمیشہ قلمی جد و جہد کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں وہ اس
سے پہلے ایک عمدہ کتاب تصوف اسلام کے نام سے شائع کر چکے
ہیں اور زیر ریویو رسالہ اسی زرین سلسلے کی دوسری کڑی ہے
یہ رسالہ مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جو آج تک بالکل
کمیاب بلکہ نایاب تھا، حسن اتفاق یا خوبی تقدیر سے ریاست
رامپور کے کتبخانہ میں مولانا عبدالماجد صاحب کی نگاہ سے اس
کا ایک کرم خوردہ نسخہ گذرا، اور یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ درحقیقت
یہ وہی مجموعہ ہے جو آج تک ناپید اور فیہ ما فیہ کے نام سے مشہور
تھا، اس کی تفحص و تجسس کا سلسلہ شروع ہوا تو ریاست حیدرآباد
دکن میں اس کے دو نسخے اور دستیاب ہوئے، ان تین نسخوں
کی نقل کے حاصل ہو جانے کے بعد ان کے دل میں اس کی اشاعت
یا موجودہ اصطلاح میں اس کے اڈٹ کرنے کا خیال پیدا ہوا، اسی
اثنا میں ان سے اور کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر
نکلسن سے جو مولانائے روم کے خاص شیدائیوں میں ہیں،
اس رسالہ کے متعلق خط و کتابت شروع ہوئی اور انہوں نے
اپنے قسطنطنیہ کے ذی علم دوستوں کے ذریعہ سے اس رسالہ کا

وہاں بھی کھوج لگانا شروع کر دیا، خوش قسمتی سے وہاں اس کے چار نسخے دستیاب ہوئے، جن کے مقابلہ سے اس نسخہ کی ایک اور نہایت خوشخط اور صحیح نقل تیار ہو گئی، جو صحت کے ساتھ ہندوستان کے تینوں نسخوں سے زیادہ جامع اور مکمل بھی تھی بہر حال مولانا عبدالماجد کی تفحص و تلاش کا سلسلہ ۱۹۲۱ء سے شروع ہوا، اور آج آٹھ برس کی سعی و تلاش کا یہ نتیجہ ایک مہذب صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

اصل رسالہ ۲۴۳ صفحات میں ختم ہوا ہے اور اس کی اشاعت سے ہم پر مولانا عبدالماجد نے یہی احسان نہیں کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا جو فضل ان پر کتب خانہ رامپور میں ہوا تھا اس میں ہم سب کو شامل کر لیا ہو بلکہ اس رسالے سے الگ انہوں نے اس کی ابتدا میں سات صفحے کا ایک دیباچہ لکھا ہے، جس میں اس رسالے کے مختلف نسخوں کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور ان لوگوں کے نام بتائے ہیں جن سے ان کو اس اہم کام میں مدد ملی ہے اس کے بعد ۳۴ صفحوں میں مولانا رومؒ کے حالات لکھے ہیں۔ پھر گیارہ صفحات میں خود اس رسالہ پر مفصل تبصرہ کیا ہے، اور اس تبصرہ کا خلاصہ یا اس رسالہ سے ان کی اشاعت کا مقصد ان کے الفاظ میں یہ ہے۔

مولانا کا تصوف اسلام کا تصوف تھا، کتاب سنت کا تصوف تھا، طاعت و عبادت کا تصوف تھا

تقوی و طہارت کا تصوف تھا، رندی و بے قیدی
آزادی و وارفتگی کا تصوف نہ تھا، مولانا کی مجالس
ذکر الٰہی، و تزکیۂ نفس کی مجالس ہوتی تھیں۔ فیہ ما فیہ
شروع سے آخر تک اسی تعلیم سے لبریز ہے، کہیں کسی
آیت قرآنی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے، کہیں کسی حدیث
نبوی کی شرح ہو رہی ہے۔ کہیں ملحدوں اور بدمذ
مذہبوں کی تردید ہو رہی ہے، کہیں نماز کے لطائف
و اسرار بیان ہو رہے ہیں، کہیں اصول و عقائد اسلام
کی خوبیاں روشن کی جا رہی ہیں، کہیں اصلاح نفس
و تزکیۂ باطن کے طریقوں کی تعلیم ہو رہی ہے، کہیں
اگلے بزرگوں اور اللہ کے دوستوں کے مناقب
و فضائل ذکر ہو رہے ہیں۔ بس ان کے علاوہ شروع
سے آخر تک کسی مقام پر نہ آجکل کی رسمی پیرزادگی و
سجادہ نشینی کا ذکر ہے، نہ قبور کے سجدہ و طواف کا
نہ چادر اور گاگر کا، نہ مروجہ عرس اور غسل مزارات کا،،

اس تبصرہ سے اگرچہ اس رسالہ کی بہت سی خوبیاں نمایاں ہو
جاتی ہیں، لیکن اردو خواں گروہ کے لئے اس سے زیادہ تشریح و توضیح
کی ضرورت تھی، بہتر تو یہ تھا کہ اس رسالے میں جس قدر مضامین مذکور
ہیں سب کے الگ الگ عنوانات قائم کئے جاتے، اور ہر عنوان

کے تحت میں بتا دیا جاتا کہ یہ مضامین فلاں فلاں صفحات میں درج ہیں
اور اگر ممکن ہوتا تو ان کا خلاصہ بھی لکھدیا جاتا جیسا کہ انہوں نے
گمراہ فرقوں کی تردید کے متعلق متعدد صفحات کے حوالے دیئے
ہیں۔ کتاب میں جو آیتیں اور حدیثیں آئی ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے
حاشیے میں ان کے ترجمے کر دیئے ہیں اور مزید کرم یہ کیا ہے کہ حدیثوں
کی تخریج اور ضعف و صحت کی طرف بھی اشارات کئے ہیں لیکن عربی
کی جو طویل عبارتیں کتاب میں مذکور ہیں معلوم نہیں ان کی توجہ
سے کیوں محروم رہیں؟ حالانکہ اردو خواں بلکہ فارسی خواں گروہ
کے لئے اس کی اشد ضرورت تھی۔

ان جزئیات سے قطع نظر کرکے اصل رسالے پر نگاہ ڈالی جائے
تو جیسا کہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے۔ کہ:۔

"اور ہر حیثیت سے فیہ ما فیہ اور مثنوی دونوں ایک
ہی پھول کی پنکھڑیاں، ایک ہی گلشن کی بہاریں
ایک ہی نور کی تجلیاں ہیں"

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نثر میں مثنوی کا خلاصہ ہے؛ اس لئے اگر
کسی کو مثنوی کے خلاصے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو وہ اس رسالے
سے اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ البتہ اس اختصار کی وجہ
سے اس میں مثنوی کی سی تکرار و تفصیل نہیں پائی جاتی، اور جو کیف
و مستی اور سوز و گداز مثنوی کے اشعار میں ہے، وہ اس کی سیدھی

سادھی عبارت میں پایا نہیں جاتا، اس کے علاوہ مثنوی کی اور تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ مثلاً مثنوی میں عموماً تمام مطالب کو تمثیلات و حکایات کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے۔ اور اس رسالہ میں بھی حکایات و تمثیلات سے ہر جگہ مطالب ذہن نشین کئے گئے ہیں، اس لئے جو لوگ صرف معانی و مطالب کی توضیح چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ رسالہ مثنوی سے زیادہ مفید ہے، مثنوی کا جوش و خروش اور سوز و گداز عوام تو عوام خواص کو بھی اس کے اصل مطالب کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا، اس سے خود رفتگی اور سراسیمگی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہی خود رفتگی اصل مطالب پر پردہ ڈال دیتی ہے، لیکن اس رسالے کے پڑھنے سے وہی مطالب نہایت سادہ طور پر ذہن میں آجاتے ہیں، اور کوئی چیز ان کی وضاحت میں مخل نہیں ہوتی۔ بہر حال مثنوی کی توضیح و تشریح کا جو غیر مختتم سلسلہ اب تک جاری ہے، یہ رسالہ بھی اسی کی ایک زرین کڑی ہے، اور اس حیثیت سے نہایت قابل قدر ہے، کہ خود مولانا کے روم ہی نے اپنی زبان سے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں،

یہ رسالہ ہمارے مطبع معارف میں نہایت عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ چھپا ہے، اور یہیں سے مل سکتا ہے، ۱۲/ قیمت ۸/-

(ع" در رسالہ معارف ماہ اپریل ۱۹۲۹ء)

۲۔ مضمون نگاری کی ابتداء کیونکر کرنی چاہیئے

جو لوگ مضمون نگاری کی ابتدائی مشق کرنی چاہتے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے چھوٹے چھوٹے توضیحی مضمون لکھیں۔ اس قسم کے مضمونوں پر طبع آزمائی کرنے سے پہلے یہ ضرورت اچھی طرح سے محسوس کر لینی چاہیئے۔ کہ جس چیز پر مضمون لکھنا مقصود ہو اس کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا جائے تاکہ اس چیز کے ہر جزو اور ہر خصوصیت کا گہرا نقش دماغ میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ جب تک کہ خود مضمون نگار کے ذہن میں اس چیز کا عکس محفوظ نہ ہوگا۔ اسوقت تک وہ الفاظ کے ذریعہ سے دوسروں کی نظر کے سامنے اس چیز کی تصویر کیونکر پیش کر سکے گا۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیئے کہ جس چیز کو خود مضمون نگار نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا ہے اس پر مضمون لکھنے کی کوشش نہ کرنی ہی بہتر ہے لیکن اگر بدرجۂ آخر ایسی خیالی چیز پر ایک خیالی مضمون لکھنا ناگزیر ہو تو قلم اٹھانے سے پہلے مضمون نگار کو چاہیئے کہ وہ اس چیز پر دیگر مستند مضمون نگاروں کے مضامین پڑھے اور ہر تفصیل کو اچھی طرح سمجھے اور دل و دماغ میں جگہ دے۔ جب اس طرح اس چیز کا ایک واضح عکس ذہن میں قائم ہو جائے تو اس کے بعد اس چیز پر مضمون لکھنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد بھی اندیشہ یہی رہیگا کہ مضمون نگار چوک جائے گا۔ اور مضمون تنقید کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔ توضیحی مضامین سے مضمون نگاری کی ابتدا کرنے میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ یہ مضامین چیزوں کے متعلق ہوتے ہیں اور چیزوں ہی کی وضاحت کرتے ہیں، اور قدرتی طور پر دیکھی ہوئی چیزوں کی وضاحت بہ مقابلہ

اور باتوں سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔

جب توضیحی مضامین کے لکھنے میں کافی مہارت حاصل ہو جائے تو داستانی مضامین لکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن اس سلسلے میں بھی وہی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو داستانی مضامین لکھے جائیں وہ ان واقعات سے متعلق ہوں جو یا جس طرح کے واقعات مضمون نگار کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ اگر یہ نکتہ پیش نظر نہ رکھا جائے گا تو مضمون کسی طرح کامیابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکیگا۔ بلکہ اپنے ساتھ اپنے لکھنے والے کی وقعت کو بھی لے ڈوبیگا۔

توضیحی اور داستانی مضامین کے بعد ان مضمونوں کا نمبر آتا ہے، جو توضیحی اور داستانی ہر دو اقسام کے مضامین کا مجموعہ ہوتے ہیں اور جن میں بعض چیزوں کی توضیح اور بعض واقعات کی داستان مندرج کی جاتی ہے۔ یہ مضمون بھی خیالی اور بے بنیاد نہیں ہونے چاہئیں۔

جب مذکورہ بالا اقسام کے مضمون لکھنے کی کافی مہارت ہو جائے گی اور کامیاب مضامین قلم سے نکلنے لگیں گے تو پھر تاریخی اور طرح طرح کے ذہنی مضمونوں کے لکھنے میں زیادہ دشواری محسوس نہ ہوگی لیکن اس موقع پر یہ واضح رہنا چاہیئے کہ خواہ مخواہ عبارت آرائی سے گریز کرنا ہر حالت میں مناسب ہوتا ہے، کیونکہ عبارت آرائی سے مراد تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کیا جانا ہے جو بعض اوقات مفہوم کا خون کر دیتا ہے۔ فرض کرو کہ تم کوئی واقعہ بیان کر رہے ہو اور منشا یہ ہے کہ تمہارا مخاطب اس واقعہ کا تصور بالکل اسی طرح اپنے ذہن میں قائم کرے جس طرح وہ واقعہ تمہارے دماغ پر نقش ہے تو ضروری ہے کہ تم اس کو

وزروں سے موزوں الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیلات سنا دو۔ لیکن اگر تم نے اس واقعہ کی داستان بیان کرنے میں عبارت آرائی یا بہ الفاظ دیگر تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا مافی الضمیر غلط رنگ میں تمہارے مخاطب کے ذہن میں اُتر جائے گا۔

مثلاً تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ "محکوم ہندوستانیوں کے محکوم نمائندے مجلس قانون ساز ہند میں ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کی درد بھری کہانی سُنا رہے تھے" مگر تم اس بات کو ان لفظوں میں کہتے ہو "کہ بھوکے ہندوستان کے بھوکے شیر مجلس قانون ساز ہند میں گرج رہے تھے" تو اب تمہیں فیصلہ کر لو کہ اس عبارت آرائی کے بعد تم نے اول الذکر واقعہ کی ہو بہو تصویر موخر الذکر عبارت کے ذریعے سے کھینچ دی یا نہیں؟ اور ان دونوں تصویروں کی رنگ روغن اور تفصیلات میں کچھ فرق پایا جاتا ہے یا نہیں؟ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اپنی عبارت کو تشبیہ اور استعارہ کے استعمال سے پاک و صاف رکھو اور ابتدائی مشق کے دوران میں ان چیزوں کی ہوا اپنے مضمونوں کو نہ لگنے دو۔

اب رہے تنقیدی مضامین، اُن کا لکھنا از حد دشوار ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مضمون لکھنے کی کوشش پر اپنا وقت ضائع نہ کرو بلکہ سب سے زیادہ اسی بات پر متوجہ رہو کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو اس کو کامیابی کے ساتھ ضبط تحریر میں لانے کی مہارت حاصل ہو جائے۔ کافی مہارت بعد تمہیں جملہ اقسام کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضمون لکھنے خود بہ خود آ جائیں گے۔

ؐ

۳۔ ابتدائی مشق کیلئے چند ضروری ہدایتیں

یاد رکھو کہ ہر مضمون کو لکھنے سے پہلے اس کا خاکہ تیار کر لینا چاہیئے۔ خاکہ تیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ مضمون کے اندر جو خیالات ظاہر کئے جانے والے ہیں ان کی ترتیب پہلے سے قائم کر لی جائے۔ وہ ترتیب کیونکر قائم کی جائے؟ اس کا جواب نہایت آسان بھی ہے اور نہایت دشوار بھی ہے۔ کیونکہ اول تو یہ بات مضمون کے ہاتھ ہے کہ اس کی ترتیب کیونکر قائم کی جائے۔ دوئم یہ کہ ہر مضمون نگار اپنے طرز اور اپنی مصلحت کے مطابق مضمون کی ترتیب قائم کرتا ہے لیکن یہ ان مضمون نگاروں کی بات ہی جو اپنے فن میں ماہر اور کامل ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اگر وہ نکتے پیش نظر رکھے گئے جو باب ۲ میں بتائے گئے ہیں۔ تو مضمون کی ترتیب قائم کرنے میں زیادہ دشواری محسوس ہوگی، اور جن حالات میں جو چیز تمہاری نظر سے گذری ہوگی اور جس نقطہ خیال سے تم نے اس چیز کا مشاہدہ کیا ہوگا قدرتی طور پر اسی طرح تم اس چیز پر اپنا مضمون لکھ ڈالوگے تاہم مبتدیوں کے لئے مضمون کی ترتیب قائم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے اس چیز کی تعریف کی جائے کہ وہ ہے کیا چیز (۲) پھر اس کی توضیح کی جائے (۳) اس کے بعد اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے (۴) بعد ازاں اس کے حسن و قبح سے بحث کی جائے (۵) اور آخر میں اس کے متعلق وہ باتیں ظاہر کر دی جائیں جن کو پیش نظر رکھکر مضمون لکھا گیا ہو۔

دوسری بات جو خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ مضمون کی عبارت اور

زبان ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ اشارۃً کہا جا چکا ہے ہر مضمون کی عبارت سلجھی ہوئی اور زبان صاف ہونی چاہیئے۔ اس میں ایر پھیر اور پیچیدگی یا نامانوس الفاظ کی بھرمار نہیں ہونی چاہیئے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنا مطلب ادا کر دیا جائے اور سادے سادے لفظوں میں بات کہدی جائے یہی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو جو فن انشا پردازی سے واقفیت نہیں رکھتے اور اس فن کے مرکزی اصولوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں پیچ در پیچ فقرے لکھنے اور الٹی سیدھی ترکیبوں کے الفاظ استعمال کرنے میں خاص لطف آتا ہے بعض ایسے تنگ نظر بھی ہوتے ہیں جو اس طرح دوسروں پر اپنی لیاقت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کا الٹا اثر پڑتا ہے اور ان کی قلعی خود بخود کھل جاتی ہے۔

سلجھی ہوئی عبارت لکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مبتدا اور خبر پر نظر رکھی جائے ہر فقرہ چھوٹا سا ہو، اپنی جگہ مکمل ہو اور پورے معنی دیتا ہو، غلط سلط ترکیبوں سے بچنا نہایت آسان بات ہے کہ کبھی اپنی طرف سے کوئی ایسی ترکیب گھڑنے کی کوشش نہ کی جائے جس کے ہر پہلو پر نظر نہ پہونچتی ہو۔ پھر یہ خیال بھی رکھا جائے کہ عبارت میں روانی ہو اور جو الفاظ استعمال کئے جائیں ان کے ادا کرنے میں زبان کو دقت محسوس نہ ہوتی ہو۔

مثلاً بعض لوگ خستہ حال یا پریشان حال کی جگہ مفلوک الحال لکھتے ہیں اول تو یہ بات بحث طلب ہے کہ یہ ترکیب اچھی ہے یا بری لیکن اس میں جو سب سے بڑا نقصان ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترکیب اور اسی طرح کی دوسری بہت سی ترکیبیں اردو

زبان کی فصاحت پر بار ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا مضمون لکھتے وقت اس قسم کی ترکیبوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

اچھی زبان سیکھنے کا ایک مفید اور آسان طریقہ یہ ہے کہ اردو کے مستند انشا پردازوں کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ آجکل کے عمدہ انشا پردازوں میں ان حضرات کو امتیازی درجہ حاصل ہے اور ان کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زبان مستند اور ان کی اُردو ٹکسالی ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

شمس العلما مولوی محمد امین صاحب پنشنر سشن جج جبلپور۔ مولوی سید محفوظ علی صاحب نقاش بدایوں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی۔ مولوی سید ممتاز علی صاحب لاہوری وغیرہ۔

اخبار نویس انشا پردازوں میں سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر ہمت لکھنؤ حکیم برہم صاحب ایڈیٹر مشرق گورکھپور۔ ایڈیٹر صاحب صبح دکن۔ ایڈیٹر صاحب رہبر دکن۔ کی زبان عام طور پر نمونہ بنانے کے قابل ہوتی ہے۔

پنجاب کے اخبار نویسوں میں مولانا ظفر علی خاں کا طرز نہایت شگفتہ مگر رندانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے لیکن اس میں بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود مولانا کا حصہ ہیں اور جن کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ انقلاب لاہور کی زبان بھی بُری نہیں ہوتی۔ اغلباً پنجاب کے تمام اردو اخباروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ زبان لکھنے والا یہی اخبار ہے۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ عام طور پر سب سے بڑی اور ثقیل

اردو لکھنے والا طبقہ ہمارے علمائے کرام کا طبقہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کو اُردو کی گرامر
نہیں آتی اور وہ اردو زبان کی گرامر جاننے کی ضرورت کو محسوس بھی نہیں کرتے۔
کیونکہ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ عربی کی گرامر، اردو زبان میں بھی کام دے سکتی ہے
بلکہ وہ اُردو کو ایک حقیر زبان سمجھتے ہیں۔ اور لسانیات اور لسانیات بالمقابلہ یعنی زبانوں
کے علم اور اس فن کے اصولوں سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ عربی کی ثقیل ترکیبیں ہر
وقت ان کی زبان پر رکھی رہتی ہیں اور وہ اردو لکھتے وقت ان ترکیبوں کو جابجا
ٹھونستے جاتے ہیں، وہ نہ خود سمجھتے ہیں، نہ سمجھانے سے سمجھنے کے لئے طیار ہوتے ہیں
کہ عربی کی ترکیبیں اردو زبان کے لئے اجنبی اور نامانوس ہیں اور یہ کہ ان سے اردو
کی فصاحت کا خون ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اچھی اُردو لکھنے کی مشق کرنے کی غرض سے
مستند انشا پردازوں کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ان
بزرگواروں کی تحریروں کو انشا پردازی کا نمونہ قرار دیں۔ یاد رکھو کہ اُردو
زبانوں کے اس خاندان کی ایک کمسن بچی ہے۔ جس کا نام آریائی خاندان السنہ ہے
فارسی کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے لیکن عربی زبان ایک غیر خاندان کی زبان
ہے، اور اُردو سے اس کا کوئی دور کا بھی رشتہ نہیں۔ پھر یہ بھی سمجھ لو کہ اردو زبان کی
گرامر بالکل جدا ہے، نیز یہ کہ اردو زبان کی قدرتی بناوٹ عربی ترکیب کے لفظوں
کو اُردو کے اندر آسانی کے ساتھ جگہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی، لہٰذا
اگر عربی الفاظ اور عربی ترکیبیں اُردو میں استعمال کی جائیں تو لازم ہے کہ وہ اُردو
زبان کی خراد پر چڑھا لی جائیں۔ ورنہ ان کا استعمال اردو زبان کی فصاحت کا
خون کر دیگا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے عربی الفاظ اور عربی زبان کی مرکبات

اور مفرد اصطلاحیں اردو زبان میں داخل ہو کر اس کا جزو بن گئی ہیں ہم ان پر کوئی
اعتراض کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں اور پورے زور شور کے ساتھ کہتا ہوں
کہ آئندہ کے لئے یہ دروازہ بند ہو جانا چاہئے۔ ورنہ اردو، اردو نہیں رہے گی۔ مندرجہ
ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہو گا کہ اردو زبان کے اندر عربی زبان کا بہت بڑا ذخیرہ
موجود ہے۔ لیکن آج اردو کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اس میں عربی الفاظ داخل
کئے جائیں اور عربی الفاظ کے ذخیرہ کو ترقی دی جائے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ اردو
کی گرامر سے کام لیکر زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق نئے نئے الفاظ تراشے جائیں
اور ایسے الفاظ کثرت کے ساتھ تحریر و تقریر میں استعمال کئے جائیں کیونکہ کسی زبان کی
ترقی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس میں کسی غیر زبان کے الفاظ کثرت کے ساتھ بھر دئیے
جائیں بلکہ اسکی اصلی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس زبان میں ایسے نئے الفاظ داخل
کئے جائیں جو اس کی گرامر اور اس کی قدرتی بناوٹ کے عین مطابق ہوں۔

ذیل میں وہ جدول درج کی جاتی ہے جو جرمنی کے ایک ممتاز عالم لسانیات نے
اپنی ایک تصنیف میں درج کی ہے اور جس میں ان الفاظ کی تعداد علیحدہ علیحدہ دکھائی گئی
ہے جو اصلاً غیر زبانوں سے علاقہ رکھتے ہیں اور جو اردو کی ترکیب میں داخل ہو گئے
ہیں۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ اردو زبان کی بنیاد ہندی ہے، نہ کہ
عربی۔ وہ جدول یہ ہے:-

ہندی (جس میں پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خاص
الفاظ بھی شامل ہیں) تقریباً ۴۲۰۰۰

اردو (یعنی غیر زبانوں کے وہ الفاظ جو ہندی کے ساتھ

ل کر اردو میں آ گئے ہیں) تقریباً	۱۸۳۰۰۰
عربی تقریباً	۷۵۰۰
فارسی "	۶۰۰۰
سنسکرت "	۶۰۰
انگریزی "	۵۰۰
مختلف الفاظ یعنی وہ الفاظ جو ترکی عبرانی، سریانی، یونانی پرتگالی، فرانسیسی، لاطینی، پالی، ملاباری سے اردو میں آئے ہیں تقریباً	۲۰۰
کل میزان تقریباً	۵۵۰۰۰

اسی بحث کے ساتھ یہ بتا دینا بھی فایدے سے خالی نہ ہوگا کہ عربی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مفرد مادّوں کی کثرت ہے۔ لہٰذا اگر ان مادوں سے کام لینا اور فایدہ اٹھانا مقصود ہے تو اس کی سیدھی سادھی تدبیر یہ ہے کہ ان مادّوں کو اردو زبان کی گرامر کی خراد پر چڑھا کر ایسے الفاظ بنائے جائیں جو اردو کے الفاظ کہلائے جا سکیں۔ کیونکہ اس طرح عربی کے مادّوں سے خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہو جائے گا، ہماری زبان کی ترقی بھی ہوگی اور اس کی فصاحت، اور اس کے عام فہم ہونے پر بھی کوئی مضر اثر نہ پڑے گا۔

ایک اور بات بھی ہے جو تمہیں اپنے صفحہ قلب پر اچھی طرح نقش کر لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ تم جو کوئی مضمون لکھوگے اس سے تمہارا مقصد اصلی غالباً یہ ہی ہوگا کہ دوسرے لوگ تمہارے مضمون کو پڑھ کر تمہارے ہم خیال ہو جائیں لیکن ہم خیال بننے کے

لئے لازم ہے کہ دوسرے لوگ تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں اگر وہ تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ ہی نہ سکیں گے تو تمہارے ہم خیال کیونکر بن سکے (یہ بات ذہنی مضامین سے متعلق کہی جا رہی ہے) لہٰذا اگر تم دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہو اور اس بات کی خواہش رکھتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تمہارے ہم خیال بن جائیں تو تمہیں عام فہم زبان لکھنی چاہئیے اور اپنے مفہوم کو سیدھے سادھے لفظوں میں ادا کر دینا چاہیئے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا مقصد اصلی فوت ہو جائیگا اور تمہاری ساری محنت اکارت ہو جائے گی۔

اس کتاب میں مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا اب اور جو کچھ باقی ہے اسے اگلے دو حصوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ کہوں گا۔

۴۔ مثالیں

ذیل میں جو مثالیں تمہارے مطالعہ اور تمہاری رہنمائی کے لئے درج کیجاتی ہیں وہ بعض مستند انشاپردازوں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ مولف خود بھی اس قسم کی مثالیں لکھکر ان شامل کتاب کر سکتا تھا لیکن اُن سے ناظرین کتاب کو اتنا فائدہ کسی طرح نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا کہ ان مثالوں سے پہنچیگا کیونکہ یہ مثالیں بہترین اہل فن کے قلم کی نکلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کو بار بار پڑھنا اور ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ عمدہ اور کارآمد نکتے خود بخود ذہن نشین ہو جائیں۔

ہاتھی

ا۔ دیکھنا وہ جھومتا ہوا ہاتھی آ رہا ہے، ذرا پاؤں کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی! نہ گرد

وہ جب راستے سے گذرتا ہے تو گھنٹے کی آواز سُن کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ جاتے ہیں اور اُس کو رستہ چھوڑ دیتے ہیں۔

۲- کتنا بڑا ڈیل ڈول خدا نے اُس کو دیا ہے۔ یہ صحرائی جانوروں میں سب سے بڑا اور زیادہ قوی ہے۔

۳- اس کے پاؤں گویا عمارت کے ستون ہیں۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر شوخ اور تیز ہیں۔ کان کیسے چوڑے چکلے ہیں جن کو پنکھے کی طرح ہلاتا جاتا ہے۔

۴- ہاتھی کی گردن بہت چھوٹی مگر نہایت موٹی ہے جو ایسی موٹی نہ ہوتی تو اُس کے سر کا بھاری بوجھ کیونکر اٹھاتی؟ اوپر کے جبڑے میں سے کیا اچھے دو لمبے اور سفید دانت نکلے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے ہی سخت اور وزنی ہوتے ہیں۔ دانت سب ہاتھیوں کے نہیں ہوتے مگر سونڈ سب کے ہوتی ہے۔

۵- ہاتھی کے تمام جسم میں سونڈ ہی عجیب و غریب چیز ہے۔ سر سے پاؤں تک لٹکی ہوئی ہے کیسی گاؤدم ہوتی چلی گئی ہے۔ یہی اس کی ناک ہے اور یہی اس کا ہاتھ۔ اس کو ہر طرف گھما سکتا ہے۔ اسی کے وسیلے سے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اٹھا سکتا ہے۔

۶- ہاتھی اپنی سونڈ سے درختوں کو اکھیڑتا اور شاخوں کو توڑتا ہے۔ درخت کی شاخ کو سونڈ میں لیکر پنکھے کی طرح جھلا کرتا ہے۔ کوئی چھوٹا سا دانہ زمین پر پڑا ہو تو اسکو بھی سونڈ کی نوک سے اُٹھا سکتا ہے۔

۷- اس کو غسل کا بڑا شوق ہے۔ اپنی سونڈ میں پانی بھر کر بدن پر چھڑک لیتا ہے اور پینے کے وقت منہ میں ڈال لیتا ہے۔ کوتاہ گردن ہونے کی وجہ سے اپنے منہ کو پانی

تک نہیں پہنچا سکتا ہو

۸۔ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں یہ جانور پایا جاتا ہے۔ جب اس کو بنوں اور جنگلوں میں سے پکڑ کر آدمی سدھا لیتے ہیں، تو وہ بڑا ہوشیار حلیم اور فرمانبردار بن جاتا ہو حتی کہ اپنے ہم نسل بھائیوں کو اپنے آقاؤں کے ہاتھوں گرفتار کرا دیتا ہے۔

گھوڑا

۱۔ گھوڑا نہایت بانکا، قوی چالاک اور خوبصورت چوپایہ ہے۔ اس سے انسان کو بہت کچھ منفعت اپنے کاروبار میں حاصل ہوتی ہے۔ سواری بھی دیتا ہے۔ باربرداری کے بھی کام کا ہے۔ گاڑی اور توپ گھسیٹتا ہے۔ یورپ میں وہی ہل چلاتا ہے۔ لڑائی کے میدان میں انسان کا بڑا رفیق ہے۔

۲۔ اس کے ایال اور دُم ہوتی ہے۔ اپنے چاروں پاؤں سے چلتا ہے۔ اس کی چال رہوار، دُلکی، پویہ، سرپٹ کہلاتی ہے۔ اس کے سم بیلوں کی طرح دو پھٹے نہیں ہوتے وہ پتھریلے اور سخت رستوں میں چلنے سے گھس جاتے ہیں۔ سم کی حفاظت کے لئے لوہے کے نعل جڑ دیے جاتے ہیں۔

۳۔ اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور اکثر وہ اپنے رنگ کے نام سے بولا جاتا ہے جیسے کمیت، سرنگ، سمند، سبزہ، شرغہ، نقرہ، ابلق مشکی کبھی گھوڑا اپنے ملک کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ مثلاً ترکی، تازی، عراقی، پہاڑی، کاٹھیاواڑی وغیرہ۔

۴۔ عرب کا گھوڑا تازی کہلاتا ہے۔ وہ بے نظیر مشہور ہے، بڑا چالاک جاندار اور

نہایت اصیل ہوتا ہے۔ ایسا گھوڑا دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پایا جاتا۔ عرب کے لوگ گھوڑے کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے پرورش کرتے ہیں۔ اُس کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ کبھی چابک نہیں مارتے۔ بلکہ آواز یا باگ کے اشارے سے کام لیتے ہیں۔ اور قومیں جو عمدہ طریقہ پرورش کا نہیں جانتیں وہ اپنے گھوڑوں کو زد وکوب سے بدمزاج بنا دیتی ہیں۔

۵۔ اب دنیا میں صحرائی گھوڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ صرف ایشیا اور امریکہ کے بعض حصوں میں صحرائی گلے پائے جاتے ہیں۔ جب اُن کے سونے کا وقت ہوتا ہے تو وہ ایک گھوڑے تمام گلے کی پاسبانی کیا کرتے ہیں۔ کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو فوراً سوتوں کو ہوشیار کر دیتے ہیں۔

برق یا بجلی

اکثر بچوں میں بعض لڑکے یہ کھیل کھیلا کرتے ہیں کہ کبوتر یا کسی اور جانور کا تازہ پر لیکر اُس کو تختی یا سلیٹ پر رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے اُس کی ڈنڈی دبا کر دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جلدی جلدی اُس کے اوپر چند بار رگڑتے ہیں۔ ایسا کرنے سے پر کا رواں رواں کھل جاتا ہے۔

۲۔ اُس وقت ایک باریک سوت کا ٹکڑا تھوڑی دُور سے اُس پر کو دکھائیں تو وہ دوڑ کر اُس کو چمٹ جاتا ہے۔ اگر اس حالت میں پر کو دیوار سے لگا دیں، تو اُس کا ہر ایک ریشہ دیوار کو پکڑ لیتا ہے۔

۳۔ تم شیشے کو اُون کے کپڑے یا خشک ہاتھ پر رگڑ کر سُوت یا کاغذ کا ہلکا سا ٹکڑا

اُس کے قریب لاؤ، تو وہی تماشہ نظر آئے گا جو پر کے رگڑنے سے نظر آیا تھا یہی قوت مقناطیس میں ہوتی ہے۔ جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

۴۔ تم یہ تماشہ دیکھکر غالباً تعجب کروگے کہ یہ کیسا طلسم اور کیسا شعبدہ ہے! حقیقت میں نہ تو یہ طلسم ہے اور نہ شعبدہ، بلکہ ایک قدرتی خاصہ ہے جس سے تم ناواقف ہو اس کو **قوت کہربائی یا برق یا بجلی** کہتے ہیں۔

۵۔ اہلِ تحقیق نے دریافت کیا ہے کہ زمین وہوا اور تمام اشیا کے اندر جو اُن پر ہیں ایک نہایت لطیف چیز پھیلی ہوئی ہے لیکن ہر چیز میں وہ ظاہر نہیں ہوتی بلکہ بعض چیزوں میں کبھی کبھی اُس کا جلوہ بڑی چمک دمک سے نظر آتا ہے۔

۶۔ برق کے خواص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر وہ ایک شے میں زیادہ اور دوسری میں کم ہو اور وہ دونوں چیزیں متصل ہو جائیں تو فوراً ایک میں سے نکل کر وہ دوسری میں داخل ہوتی ہے تاکہ دونوں جسموں میں اُسکی مقدار مساوی ہو جائے۔ جب اُسکی موج رواں ہوتی ہے تو ایک چیز سے دوسری میں سرایت کرتی ہے اُس وقت ایک تیز روشنی اور مہیب آواز پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ دو ایسے بادل جن میں برق کم وبیش ہو قریب ہوتے ہیں تو تم چمک اور کڑک معلوم کرتے ہو جس وقت بجلی ابر سے زمین کی کسی چیز میں یا زمین کی کسی چیز کی بادل میں داخل ہوتی ہے تو یہی تماشہ اس وقت بھی ظہور میں آتا ہے۔

۸۔ اس قوت کی خاصیتیں زیادہ تر اسی صدی میں دریافت ہوئی ہیں اور اُن کے معلوم ہو جانے سے چند ایسے مفید اختراعات ہوئے ہیں جو انسان کے لئے نہایت کارآمد ہیں تار برقی کا جال جو اب دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلا ہوا ہے اور جس کو

ذریعہ سے دم دم کی خبریں دور دراز ملکوں کی معلوم ہو جاتی ہیں وہ اسی قوت کا ظہور ہے۔

۹۔ ایک اور آلہ ایجاد ہوا ہے جس کی وساطت سے سینکڑوں کوس تک آواز پہنچ جاتی ہے اور باہم بات چیت ہو سکتی ہے۔ ایک اور آلہ ہے جس کے وسیلہ سے آدمی کے الفاظ بجنسہ محفوظ رہتے ہیں۔ جب چاہو اس میں سے وہی بات سن لو جو برسوں پہلے کہی گئی تھی۔ بعض بیماریوں کے معالجہ میں بھی قوت برقی سے کام لیا جاتا ہے۔

۱۰۔ غرض قدرتی خزانے انہیں معمولی چیزوں میں دبے پڑے ہیں جس قدر انسان اُن سے واقفیت و شعور حاصل کرتا ہے۔ اسی قدر فیض و فائدہ اُٹھاتا ہے۔

جامع دہلی

۱۔ دلی کی مسجد جامع اُن بے نظیر عمارات میں سے ہے جن کا تذکرہ سیاحان عالم نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ اگرچہ اس مسجد کے اندر روضۂ تاج گنج کا سا باریک کام۔ رنگا رنگ بیل بوٹے، اور بیش قیمت پتھروں کی پرچین کاری نہیں ہے تاہم یہ فنِ عمارت کی تمام خوبیوں کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ زمانہ حال کے لائق انجینیروں نے بھی اس لاجواب عمارت کی نہایت تعریف و توصیف کی ہے اور اس کے بنانے والوں کے کمال صنعت و مہارت کا اعتراف کیا ہے۔

۲۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد کے بنانے والے دو بڑے مہندس اُستا حامد اور اُستا احمد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونو بھائی اپنے فن کے اُستادِ کامل

تھے لیکن جو خوشنمائی اور موزونی شاہجہانی عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کو
دانشمند مورخوں نے خود شاہجہاں کے سلیقہ کی طرف منسوب کیا ہے اور
کہا ہے کہ اس بادشاہ کو تعمیر عمارت کا صرف شوق ہی نہ تھا بلکہ اس کا دماغ اس
فن کے ساتھ ایک خاص مناسبت بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ جو عمارت اس کے
حکم سے بنائی جاتی اول اس کا نقشہ خود اس کے ملاحظہ سے گذرتا اور وہ
اپنی رائے سے مناسب ترمیم و اصلاح اس میں کرتا۔ یہ بادشاہ تعمیر عمارت
کا محض حکم دینے والا ہی نہ تھا بلکہ اپنے زمانے کے معماروں کا رہنما بھی تھا۔
۳۔ الحاصل ۱۰ رشوال ۱۰۶۰ھ ہجری کو ارک شاہجہانی سے ہزار گز کے فاصلہ
پر بجانب مغرب ایک پہاڑی ٹیلہ پر مسجد جامع کی بنیاد رکھی گئی، اور اسکی
تعمیر کا اہتمام اول سعد اللہ خاں وزیر کے سپرد ہوا پھر فاضل خاں خانساماں
کو، چھ سال کے عرصہ میں مسجد بنکر تیار ہوئی، پانچہزار راج مزدور، سنگتراش
ہر روز کام کرتے رہے۔ اور دس لاکھ روپیہ تعمیر میں صرف ہوا +
۴۔ تمام عمارت سنگ سُرخ کی ہے۔ لیکن اندر کی جانب اجارہ تک سنگ مرمر
لگا ہے، اور جا بجا سنگ موسی کی پچی کاری کی ہوئی ہے تین گنبد ہیں ۹۰ گز
کے طول اور ۳۰ گز کے عرض میں صحن کی طرف گیارہ در ہیں، بیچ کا در بہت
بلند ہے۔ ان دروں کے دونو جانب دو مینار ہیں نہایت بلند اور بغایت
خوشنما، ان کے اندر زینے بنے ہوئے ہیں، میناروں پر چڑھنے سے تمام شہر
کی سیر نظر آتی ہے۔
۵۔ صحن کے باقی تین اطراف میں بھی نہایت خوب صورت دالان اور حجرے بنے

ہوئے ہیں۔ چار کونوں پر چار بُرج ہیں بارہ دری کے بہت دلچسپ صحن کا عرض و طول ۱۳۶ گز ہے اور اس کے بیچ میں ایک سنگین حوض ہے۔ جو ہر وقت پانی سے پُر رہتا ہے۔ مسجد کے اندر آنے جانے کے لئے تین عالی شان دروازے ہیں۔ جنوبی در کے روبرو ۳۲ سیڑھیوں کا زینہ ہے۔ شمالی در کے مقابل ۳۹ کا شرقی دروازے کے سامنے ۳۵ کا ؀

روضۂ تاج محل

۱۔ شاہجہاں کی عمدہ عمارتوں میں سے یہ مقبرہ بھی ہے۔ جس کی خوبی کو دنیا کی کوئی عمارت نہیں پہنچی۔ مصالح کی عمدگی اور نقشہ کی پاکیزگی نے وہ عجیب رونق پیدا کی ہے کہ یورپ و ایشیا کی تمام مشہور عمارتوں سے یہ مقبرہ سبقت لیگیا ہے

۲۔ جس کے نام سے یہ مقبرہ معروف و مشہور ہے، وہ شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل تھی، عوام الناس نے لفظ ممتاز کو تاج بنالیا اور اب یہی لفظ عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے۔ بعد رحلت کے شاہجہاں بھی اسی مقبرہ میں مدفون ہوا۔ چنانچہ شاہ و بیگم دونوں کی تربتیں پہلو بہ پہلو ہیں۔

۳۔ آگرہ کی شرقی جانب میں دریائے جمن کے دائیں کنارے یہ عمارت واقع ہے۔ سنگ مرمر کے مربع چبوترے پر اصل مقبرہ بشکل مثمن تعمیر ہوا ہے اوس کی اوپر نہایت شاندار قبہ ہے۔ چبوترے کے چاروں گوشوں میں چار مینار نہایت بلند اور خوبصورت بنے ہوئے ہیں، اُن کے اندر مارپیچ زینہ بنایا ہے، تمام عمارت سنگ مرمر کی ہے جسکو جلا کرکے مثل آئینہ کے چمکا دیا ہے۔

۴ - اندرونی جانب میں کہیں تو اُبھرے ہوئے بیل بوٹے سنگ مرمر میں ترشے ہیں جن کے دیکھنے سے ایسا شبہ ہوتا ہے گویا پتھر کو قالب میں ڈھال دیا ہے کہیں رنگارنگ بیش قیمت پتھروں کو سنگ مرمر میں وصل کرکے گل بوٹے بنائے ہیں۔ زبرجد، زمرد، یشب، عقیق وغیرہ اس خوبی سے کام میں لائے گئے ہیں کہ اُن سے پھول پتوں کا اصلی رنگ ظاہر ہوتا ہے بعض مبصروں کا قول ہے کہ ایک ایک بوٹا سو سو ٹکڑوں سے مرکب ہے۔ اور ہر ٹکڑا بقدر مناسب تراشا گیا ہے۔

۵ - وہ خاص خوبی جس کی بدولت یہ عمارت دنیا کی عمارتوں میں فائق ہے یہ ہے کہ اس کے بیل بوٹوں کی ساخت میں غایت درجہ کا تناسب اور اُن کے رنگوں میں نہایت درجے کی موزونی ہے۔ غرض عمارتوں کی خوش اسلوبی اور گلکاری کی لطافت دیکھنے والوں کے دل پر ایسا عجیب اثر پیدا کرتی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔

۶ - مقبرے کی غربی جانب میں مسجد اور شرقی سمت میں تسبیح خانہ ہے۔ یہ دونو عمارتیں ہم شکل ہیں اور سنگ سُرخ سے بنی ہیں۔ جنوبی طرف میں ایک نہایت عالی شان دروازہ ہے اُس کے پہلوؤں میں سنگ سُرخ کے دالان دور تک چلے گئے ہیں، اسکی عمارت بھی قابل دید ہے۔ اس دروازے سے مقبرے تک حوض ہے اور اطراف حوض کی تمام زمین باغ و چمن سے آراستہ اور سرسبز وشاداب ہے۔

زبانِ گویا

(از مولانا حالی پانی پتی)

اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی ہے اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعیٔ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی، اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کے دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی۔ اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ک کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے الی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا یں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا ہے؟ اور کس سے سیکھا ہے۔ کہیں تیری باتیں ں کی گانٹھ ہیں، اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے ں کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے ہزاروں نقصان، اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری نیک نامی۔ ہماری بدنامی، ہمارا جھوٹ، ہمارا سچ، تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں، مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے، اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے، اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر، اور روح کے پیغام پر حاشیہ نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی، حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول، اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے، اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے۔ اور طوفان بھی اٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے۔ اور پھر وہی زبان کی زبان

کہلائے ہ نہیں ہرگز نہیں - اگر تو سچی زبان ہے - تو زبان ہے - ورنہ زبون ہو بلکہ سراسر زیان ہے - اگر تیرا قول صادق ہے، تو شہد فائق ہے، ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے - اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور اوروں کے دلوں میں جگہہ پائے گی - ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالا جائے گی -

اے زبان! جنہوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے - انہوں نے سخت الزام اٹھائے، اور بہت پچتائے کسی نے انہیں فریبی اور مکار کہا، کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ اُن کا نام رکھا کسی نے ریاکار ٹھیرایا، اور کسی نے سخن ساز کسی نے بدعہد بنایا، اور کسی نے غماز، غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، جھگڑا اور ضلع - جگت اور پھبتی، غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے، اور وہ سب کے سزاوار ٹھیرے -

اے زبان! یاد رکھ، ہم تیرا کہا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے ہم تیری ڈور ہرگز ڈھیلی نہ چھوڑیں گے - اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے - ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے -

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے - اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے - سبحان اللہ! وہ نام کے جانور، اور ان کا ظاہر و باطن یکساں، ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں نہیں اور زبان پر ہاں -

الٰہی! اگر ہمکو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے، تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

لکھنؤ کا محرم الحرام

(از پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار)

سینوں میں جگر پہ تیر غم چلتے ہیں
رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیاد
دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر اُدھار کھائے ہوئے مٹر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین۔ گھر گھر بکا و بین، گریہ وزاری، اشکباری، جم غفیر، مجمع کثیر۔ ایک جلے تن بول اٹھے: "اور کیوں نہ ہو، مجلس عزا کی دھوم دھام ہے لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری از شام تا دم، مشہور ہر مرد و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے۔" ان کے ساتھ ایک دوست ہو لئے تھے، ان کی بیقراری کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ

تھے۔ لوٹے جاتے ہیں کہ شہید کربلا کا واسطہ، آل مصطفےٰ کا صدقہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہ سرد بھر کر کہا، میاں اب وہ لکھنؤ کہاں؟ وہ لوگ کہاں؟ وہ دل کہاں! لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جان عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوئے اعج طور بھی غش غش کر جاتا۔ بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو، میان سے وہ نکل باہر، کسی نے ذرا چون کی۔ اور انہوں نے کھٹ سے سر ہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ جھنڈا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹے میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ وہ کا نذر جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا، وہ بھیڑ بھڑکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ!

انتظام کرتا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا، اب کوئی بھی نذر حسینؑ نہیں نکالتا، اب انیس ہے نہ دبیر مونس ہیں نہ مشیر، ضمیر ہیں نہ دلگیر ؎

افسوس جہان سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیر مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے۔ واللہ خدائے سخن تھا، سر منبر ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجۂ حسرت میں غرق ہو گئے کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت ؎

رباعی ملاحظہ ہو۔

ملاح امیر ابن امیر آتا ہے
دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاق سخن خلق جہاں آتی ہے
لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

اور انیس مرحوم کو خدا بخشے بالله العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے، قند و نبات کے ریزے، نور کے مرثیے ہیں ؎

"جوہر شناس ہے تو انہیں موتیوں میں تول"

فصحائے خطۂ پاک ایران کہتے ہیں کہ کجا انیس؟ کجا فردوسی؟ کجا کمربند مرصع کجا شال طوسی؟ بزم میں وہ ڈھنگ، رزم میں وہ رنگ کہ ؎

مضمون انیس کا نہ چہرہ اُترا
اُترا بھی تو تو کچھ بگڑ کے نقشہ اُترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی
تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرہ اُترا

لیکن ہاتھی لُٹا بھی تو کہاں تک؟ اب بھی اس شہر کی مسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ آپ کہئے کہاں کی سیدھیاں ہیں، نجف اشرف، کربلا، کاظمین میر باقر کے امام باڑے، چوبیٹیاں، جہاں چلو وا کل حسنات ہو۔ واللہ بہشت کی سیدھی راہ ہے ؎

دربار جناب مصطفےٰ کو دیکھا
ان آنکھوں سے شان کبریا کو دیکھا

فردوس میں پہونچے تو نجف میں پہونچے
جنت دیکھی جو کربلا کو دیکھا

رنگ رلیاں مناتے پیدل چلے جاتے تھے۔ راہ میں وہ بھیڑ وہ ریل پیل کہ عیاذاً باللہ! شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بعد خرابیٔ بسیار کہیں گذر جائے تو ضیق النفس ہو جائے۔ بانکے، ترچھے، ہٹے کٹے، ثقہ، مقدس، کس و ناکس، غریب، امیر، بڈھا و پیر امڈے سب چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی وضع، مومن پاک، مثل کعبہ سیاہ پوش، کوئی ماتم حسین میں سر برہنہ چلا آتا، کوئی حلہ پوشان بہشت کی طرح ہرا بھرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔

لیجیے! آغا باقر کے امام باڑے میں کٹ سے داخل ہو۔ اوہو ہو ہو! خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو، نام کر گئے۔ چکاچوند کا عالم ہے، لیکن گلی تنگ، تماشائیوں کی عقل دنگ ؎

جائے تنگ است و مرداں بسیار

مگر خلقت گھُس بیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے جو ٹرا، پھرا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہمعصر بیٹھے اگلے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کمہار بھی نادرہ کار ہیں، ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منہ سے اب بولا اور اب بولا، وہی سن کے سے بال۔ وہی سفید بھویں، وہی چتون، وہی پیشانی کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھرّیاں، وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا۔ واہ رے کاریگر، تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ ورنہ تیرا بڈھا تو اللہ ہی اللہ

وہاں سے جو چلے تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑہ میں آئے یہاں سورج مکھی پر وہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر وہ نور دیکھ پاتا تو مارے غیرت کے بحر طلسمات میں غوطے کھاتا ۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے اہلکاران سلیقہ شعار نے چکنی ڈلی اور الائچی پیشکش کی ۔ وہاں سے حسین آباد بارہ میں پہنچے ، سبحان اللہ ، سبحان اللہ ، یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضوان ! الٰہی یہ مکان ہے یا باغ جنان ؟ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرامگاہ کا نام روشن ہے ۔ امام باڑہ سجا سجایا ۔ دلھن کا ایسا جوبن تھا ۔ برجوں پر ضیاء کے موتی تو منار نور علیٰ نور ، حیرت سی ہے کہ یہ کوہ نور ہے یا شعلۂ طور ہے ۔ سرخ قندیلیں پر یاقوت احمر بھی شرمائے ۔ چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے ۔ پھر نہر مصفا جو نظر آئی تو آنکھوں میں طراوت پائی ۔

مرزا ظاہر دار بیگ کی شیخی

(از ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی)

اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا ، وہ بھی حقیقی نہیں ، عملداری سرکار میں صاحب ریذیڈنٹ کی اردلی کا جماعہ دار تھا ۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار سے دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جماعہ دار تیسرے ان دونوں کی بے عنوانی پر خود اس کی رشوت ستانی بہت کچھ کمایا ۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے رو داروں میں آ گیا مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی ۔ جماعہ دار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لیلیا ۔ جماعہ دار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا

رہا کہ مرزا کو اپنی یتیمی اور ماں کی بیوگی بھول گئی یا دنہ آئی ہوگی۔ لیکن جماعہ دار کے
مرنے پر اُس کے بیٹے، پوتے، نواسے بکثرت تھے، انہوں نے بے اعتنائی کی، اور
اگرچہ جماعہ دار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر اُن کے ورثا نے بہزار وقت محلسرا
کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ اُن کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے
کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا۔ مگر مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی
تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات! اسپر مرزا کی شیخی اور نمود! یہ مسخرہ
اس ہستی پر یہ چاہتا تھا کہ جماعہ دار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کی صدہا
روپے ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جماعہ دار والے اسکو منہ نہیں لگاتے
تھے، مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو
جان کسی کو بھائی جان بناتا۔ اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں اور ناتوں سے
ق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا
نکی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر وہ
رزادہ نہ تھا تو کیسے نبھتی۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا کہتی
کون سنتا تھا، مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی، سر پر
ہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر
شبنم یا ہلکی تن زیب نیچے کوئی طرحدار رسا ڈھاکہ کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات
سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح وشام، اور تیسرے پہر کو کاشانی
کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب
کی بیل ٹکی ہوئی، سُرخ نیفہ، پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار

اور اس قدر نیچا کر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں

اکبر ہاتھیوں کے شکار پر

(از مولوی محمد حسین آزاد دہلوی)

شیر شکار اکبر ہاتھیوں کا شوقین تھا۔ ابتدا میں فیل شکاری کا شوق ہوا۔ اور کہا کہ ہم خود ہاتھی پکڑیں گے۔ اس میں بھی نئی نئی ایجاد نکالیں گے۔ چنانچہ ۹۷۹ھ میں مالوہ پر فوجکشی کی تھی۔ گوالیار سے ہو کے نرور کے جنگل میں گھس گئے لشکر کو کئی فوجوں میں تقسیم کیا۔ ایک ایک فوج پر ایک ایک امیر کو فوجدار کیا۔ اور اپنے اپنے رُخ کو چلے۔ بہت سرگردانی کے بعد ہتھنی نظر آئی۔ اس کی طرف ہاتھی لگایا وہ بھاگی۔ یہ پیچھے پیچھے دوڑے اور اتنا دوڑتے چلے گئے کہ وہ تھک کر ڈھیلی ہو گئی۔ داہنے بائیں جو دو ہاتھی لگے ہوئے تھے ایک نے رسّا پھینکا۔ اور دونوں طرف سے لٹکا کر اتنا ڈھیلا چھوڑا کہ ہتھنی کی سونڈ کے نیچے ہو گیا۔ پھر جو تانا۔ تو گلے سے جا لگا ایک فیلبان نے اپنا سرا دوسرے کی طرف پھینک دیا۔ اس نے لپک کر دونوں سروں میں گرہ یا بل دیدیا اور اپنے ہاتھی کے گلے میں باندھ لیا۔ پھر جو ہاتھی کو دوڑایا تو ایسا دبائے چلا گیا کہ ہتھنی ہانپ کر بیدم ہو گئی۔ ایک فیلبان اپنا ہاتھی برابر لے گیا اور جھٹ اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ رستے پر لگایا۔ ہری ہری

گھانس سامنے ڈالی۔ کچھ چاٹ دی، کچھ کھلایا۔ وہ بھوکی پیاسی تھی، جو کچھ ملا اسے غنیمت معلوم ہوا۔ پھر جہاں لانا تھا لے آئے۔ ملّا کے کتا بدار کا بیٹا بھی ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کھینچا تانی میں ہاتھیوں کی روندوں میں آگیا تھا غنیمت ہوا کہ جان بچ گئی، گرتا پڑتا بھاگا۔

چلتے چلتے ایک کجلی بن میں جا نکلے۔ ایسا گھنگھور جنگل تھا کہ دن بھی شام نظر آتی تھی۔ اقبال اکبری خدا جانے کہاں سے گھیر لایا تھا کہ وہاں غول ہاتھی کا ایک گلہ چرتا نظر آیا۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اسی وقت آدمی دوڑائے اور تمام فوجوں کے ہاتھی جمع کر لیے۔ اور لشکر سے شکاری رستے منگائے۔ اپنے ہاتھی پھیلا کر رستے روک لیے اور بہت سی ہاتھیوں کو ان میں ملا دیا۔ پھر گھیر کر آہستہ آہستہ ایک کھلے جنگل میں لائے۔

پھر کٹنوں اور فیلبانوں کو ہزار آفریں کہ جنگلیوں کے پاؤں میں رسّے ڈالکر درختوں سے باندھ دیا اور ہمراہی وہیں اتر پڑے جس جنگل میں کبھی آدمی کا قدم نہ پڑا ہوگا قدرت کا گلزار نظر آتا ہے۔ رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن عید تھی، وہیں جشن منائے گلے مل مل کر آپس میں مبارک بادیں دیں۔ اور سوار ہوئے۔ ایک ایک جنگلی ہاتھی کو دو دو اکبری ہاتھیوں کے بیچ میں رسّوں سے جکڑ کر رواں حکمت عملی سے آہستہ آہستہ لیکر چلے۔ کئی دن کے بعد جہاں لشکر کو چھوڑ کر گئے تھے آن شامل ہوئے، افسوس یہ ہے کہ جاتے ہوئے جب ہاتھیوں کا حلقہ دریائے چنبل سے اترتا تھا کہ لکنہ ہاتھی ڈوب گیا۔

کی طرف پھرا۔ رستے میں قصبہ سیری پر ڈیرے ہوئے اور ہاتھیوں کا شکار ہونے لگا
ایک بڑا گلہ ہاتھیوں کا جنگل میں ملا۔ حکم دیا کہ پیادے اور سوار جنگل میں پھیل جائیں گلے
پر گھیرا ڈالکر ایک طرف کا راستہ کھلا رکھیں اور بیچ میں نقارے بجانے شروع
کریں۔ چند فیلبانوں کو حکم دیا کہ اپنے سدھے سدھائے ہاتھیوں پر سوار ہو کر
اور سیاہ دشالیں اوڑھ کر ان کے پیٹ سے اس طرح وصل ہو جاؤ کہ جنگلی
ہاتھیوں کو ذرا نظر نہ آؤ۔ اور ان کے آگے آگے ہو کر قلعہ سیری کی طرف لگا لیجاؤ
سواروں کو سمجھا دیا کہ گرد اگرد گھیرے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے چلے آؤ
منصوبہ درست بیٹھا اور سارے ہاتھی قلعہ مذکور میں فیل بند ہو گئے۔ فیلبان
کوٹھوں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ بڑے بڑے رسّوں کی کمندیں اور پھاندیں
ڈالکر سب کو باندھ لیا۔

ایک ہاتھی بڑا بلونت اور مستی میں بھرا ہوا کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ حکم دیا کہ
ہمارے کھانڈے رائے ہاتھی کو لیکر اس سے لڑاؤ۔ وہ بڑا تھا اور جنگی ہاتھی
تھا۔ آتے ہی ریل دھکیل ہونے لگی۔ ایک پہر دونوں پہاڑ ٹکرائے۔ آخرکار
جنگلی کے تیشے ڈھیلے ہو گئے۔ قریب تھا کہ کھانڈے رائے اُسے دبا لے۔ حکم
ہوا کہ شعلیں جلد جلا کر مارو تاکہ اُس کا پیچھا چھوڑ دے۔ بڑی مشکلوں سے جُدا
ہوئے۔ مگر جنگلی دیوزاد جب ادھر سے چھٹا تو بھاگا اور قلعے کی دیوار ٹکروں اور
ٹھوکروں سے توڑ کر جنگل کو نکل گیا۔

یوسف خاں کوکلتاش (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے بھائی) کو کئی ہاتھی اور
ہتھنیاں دیکر اُس کے پیچھے بھیجا اور کہا کہ رن بھیروں ہاتھی کو دکہ حلقہ خاص کا

ہاتھی اور بدمستی اور نہ بردستی میں بدنام عالم تھا۔ جاکر اُلجھا وہ۔ تھکا ہوا ہے۔ ہاتھ آجائے گا۔ اس نے جاکر پھر لڑائی ڈالی، فیلبانوں نے رسّوں میں پھانس کر ایک درخت سے جکڑ دیا اور دو تین دن میں چارے پر لگا کر لے آئے۔ چند روز تعلیم پاکر فیلہائے خاصہ میں داخل ہو گیا اور گج پتی خطاب پایا۔

مکھیاں مارنیوالے دُوکاندار

(از ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی)

بازار سے سودا خریدنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہی کبھی آپ نے ایسے دوکانداروں کو بھی دیکھا ہے جن کی پیشانی پر بل پڑے ہوتے ہیں جن کی آنکھیں کچھ اس طرح آدھی بند اور آدھی کھلی ہوتی ہیں کہ گویا کسی نے زبردستی سوتے سے جگا دیا ہو جن کا جسم اور جن کے کپڑے اس قدر میلے اور غلیظ ہوتے ہیں کہ دور ہی سے بدبو آتی ہے، اور جن کے جسم کے ڈھیلے ڈھالے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے جسم پر سے مکھی اڑا دینی بھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ ایسے دوکانداروں کو لوگ بھی زیادہ تکلیف نہیں دیا کرتے۔ ان کی دوکان پر کوئی شامت کا مارا اتفاق ہی سے جا پھنستا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک خصوصیت ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ جو ان کی دُکان پر پہنچ گیا وہ آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا ہے۔ ان کی کاہلی انہیں اجازت نہیں دیتی کہ گاہک کو لالا کر جلدی جلدی دس بیس طرح کی چیزیں دکھائیں، ان کے دماغ نے انہیں اس دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے کہ بہت سی چیزیں سامنے موجود ہوں تو گاہک گھبرا جاتا ہے اور پھر کوئی سی بھی چیز نہیں خریدتا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ گاہک سے اگر

میٹھی زبان سے باتیں کیں تو وہ دوست بن جاتا ہے اور قیمت میں رعایت کا طالب ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے ہمیشہ نہایت نرمی کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیئے صبح کو جو سامان کسی گاہک کے دکھانے کو نکالا تھا اسے واپس اپنی جگہ پر نہ رکھنے کے لئے ان کی سستی نے یہ عذر سوچ لیا ہے کہ بار بار اُٹھانے اور رکھنے سے مال خراب ہو جاتا ہے اس لئے جو چیز ایک مرتبہ نکال دی اسے کم سے کم تمام دن باہر ہی پڑا رہنے دینا چاہیئے تاکہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کا خریدار آجائے تو دوبارہ نکالنے کی زحمت نہ ہو۔ ان کے خیال میں یہ اصول بالکل غلط ہے کہ کم نفع لیا جائے اور زیادہ مال بیچا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں دوکاندار پر بار بار تولنے اور ناپنے کی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے اور اس کی بہت سی قوت عمل خرچ ہو جاتی ہے جو یقیناً اسراف میں داخل ہے ان کا اصول یہ ہے کہ کم بیچو اور زیادہ نفع لو۔ اس میں دُہرا فائدہ ہے ایک طرف تو مال دوکان میں بھرا رہتا ہے اور دوسری طرف قوت عمل دوکاندار کے بدن سے باہر نہیں نکلنے پاتی۔ گاہک تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ ان تاجروں کی روکھی صورت غلیظ لباس اور بدخلقی کی وجہ سے ان کی دوکان پر نہیں جاتے۔ مگر ان دوکانداروں کا خیال یہ ہے کہ دوکان پر گاہکوں کی کبھی بھیڑ نہ ہونی چاہیئے کیونکہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ چپکے سے کوئی چیز اُٹھا کے لیکر چل دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تاجروں کا خیال درست ہو لیکن دنیا یہی کہتی ہے کہ ایسے تاجر کبھی کامیاب نہیں ہوتے تجارت کی تمام تر کامیابی دوکان کی صفائی اور آرائش اور دوکاندار کی خوش وضعی خوش کلامی اور حُسن خلق پر منحصر ہے ؎

عجائب خانہ صلح وجنگ کی سیر

(از عبدالقادر لاہوری)

سوئٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حسن قدرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر لوسرن اور اس کے قرب وجوار کو یہاں کی سینری کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے تو قدرت کے مناظر کا مرکز لوسرن ہے۔ کوہ الپس برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقعہ مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر ایک قابل دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں۔ مناظر قدرت کے شیدائی دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ اور محبوبۂ بہار کو بہ صد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں۔ موسم گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہوگی جنہیں دولت و فراغت دونوں میسر ہیں وہ تو یہاں آکر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس کو مرکز قرار دیکر گرد ونواح کی سیر کرآتے ہیں اور پھر یہیں آجاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے درمیان یعنی اپریل کے شروع سے ستمبر کے آخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہرو فرض کئے جائیں جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پر فضا مقام کی سیر کرتے ہیں تو آدھے ایسے ہیں جو یہاں معقول عرصہ کے لئے قیام کرتے ہیں۔ انہی آنے جانیوالوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں اور انہی کے طفیل سیر وسفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی

چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے۔ اُس کی سڑک کو دور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح
بل کھاتی ہوئی قلعہ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لے جانے
اور اس کے لیجانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی
گئی ہیں جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو سرک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کیلئے
ہر وقت دخانی جہاز چلتے ہیں جو مختلف قابل سیر موقعوں پہ ٹھہرتے ہوئے جاتے
ہیں اور ہر جگہ لوگ اُتر کر آگے تھوڑی دور پیدل سیر تماشہ کے لئے چلے جاتے ہیں
اس کے سوا گاڑیاں ہیں، گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں جس
مذاق کا کوئی آدمی ہو، اپنی پسند کی سواری ڈھونڈھے اور سیر کرتا پھرے
سبزہ وگل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے لینا
چاہے تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں
کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں، لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا
دیکھا کرے۔ شام کے قریب باجہ بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے
شروع ہوتے ہیں جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے اور مکانوں
کے لیمپ اور سڑک کی لال ٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی
ہیں لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو اور
گوشۂ تنہائی کی تلاش میں ہو تو وہ آبادی سے کچھ دور نکل جائے، چاروں طرف
مناظر قدرت اس کے مونس ہمدم ہوں گے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں
ہو گی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہو گا اور اس کی
خیالات نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا، نہ اس تخلیہ میں خلل ڈالنے

والا اگر کہیں اسی شوق کا مارا، اسی کا ہم خیال کوئی اور بھی آنکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود ہی اور گوشہ ڈھونڈے گا۔

ہماری سیر ان دونوں قسموں سے علیحدہ تھی، ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے، ایک پھول سے دوسرے پر ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے، ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام۔ ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت وصنعت کے جلوے!

۱۹ جولائی ۱۹۱۹ء کو **عجائب خانہ صلح وجنگ** لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ عجائب خانہ تھا۔ جو بیس مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلات حرب اور طریق جنگ میں قدیم زمانوں سے لیکر آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کی منشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔

داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پرانی سے پرانی توپوں سے لیکر زمانہ حال کی کرپ کی توپیں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک پر لکھا ہوا ہے کہ کون سی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے، برچھیاں، تلواریں اور دوسری طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحہ روما کے لئے ہے۔ اور ایک ازمنہ متوسطہ یورپ کے لئے جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحہ استعمال ہوئے تھے۔ اُن کا علیحدہ مجموعہ ہے۔

پہاڑی لڑائی کا سین جدا ہے اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جدا۔ یہ نظارے
تاریک کمروں میں بڑی خوبی سے دکھلائے گئے ہیں کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا
ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ
اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہو بہو دکھائی دیتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ہم
پنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر میں جنگ روس و جاپان بھی موجود ہے۔ قلعہ بندی کے دستور کی ترقی
کے مختلف مدارج، بیماروں اور زخمیوں کے اٹھانے اور لیجانے کی ترکیب
جنگ میں عارضی پل بنانے اور توڑنے کے نمونے، بحری لڑائی کی خصوصیات سب
کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ
کے سب بڑے بڑے مدبروں کی تصویریں رکھی ہیں جو صلح عام کی حامی ہیں اور
مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں۔

ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبر کی تصویر دیکھکر ہمیں خوشی ہوئی
س تصویر کے نیچے لکھا تھا، "رفیع الدولہ مرزا رضا خاں دانش ...."
ہل یورپ نے آجکل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی
ا مدبروں کی صف اول میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوا۔ اس کمرے میں جس پر
ہلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا مختلف زبانوں میں صلح کے متعلق کتابیں اور رسالے
ور اخبارات رکھے تھے، جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے تھے اور ہر ایک
خص مجاز تھا کہ اُن میں سے چند چُن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے،
لیکن ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت

جوش دلانیوالے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور ان کے خلاف یورپ کو اکسانے کے مضمون درج تھے، وہ بھی انہیں کاغذات صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صلح ایسی ہی تدابیر صلح پھیلانیکے لیئے کر رہی ہے اور ان کے قول و فعل میں ایسی ہی مطابقت چاہیئے حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبرین یورپ کا مقصود اصلی صرف اسی قدر ہے کہ یورپ کی عیسائی حکومتوں میں صلح رہے اور وہ سب ملکر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں۔ جب تک دول یورپ اور ان کے مدبروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے، کیونکہ یہی دو خیال سب فساد کی بنا اور جنگ و جدال کی جڑ ہیں۔

اس صلح و جنگ کے عجائب خانہ میں آلات حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صلح سے جو نسبت ہے غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوق جنگ و شوق صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں، اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ سے زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہیں اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہیں کہ بوقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بیجان کئے جا سکتے ہیں اور زمین سے گولے مارنے کے بجائے آسمان پر چڑھکر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے؟

دیہات کی زندگی

(از مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی)

اے شہروں کے عالی شان محلوں میں رہنے والو! تمہیں نہیں معلوم کہ دیہات والے دنیا کا کیا لطف اٹھاتے ہیں! تم ایک منزل عشرت میں ہو۔ عالم کی نیرنگیاں تمہاری نظر سے بہت کم گذرتی ہیں۔ جس مقام پر تم ہو۔ وہاں صبح و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں۔ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف کو چلی اور کیا بہار دکھا گئی۔ مگر غریب دیہات والے جنہیں تم نے اکثر ذلت کی نظر سے دیکھا ہوگا۔ وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر صبح انہیں ایک نیا لطف دکھاتی ہے اور ہر شام سے انہیں ایک نئی کیفیت نظر آتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے ہی نیند کا پورا مزہ اٹھا چکتے ہیں۔ صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے کہ وہ اپنی رات کی گزری راحت سے اکتا چکتے ہیں۔ ایسے وقت میں نسیم سحر کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے انھیں جگانے لگتے ہیں۔ پھر صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ آتی ہے اور انہیں جگاتی ہے۔ اگر وہ کروٹیں بدل بدل کے رہ جاتے ہیں۔ باد سحر یونہی اصرار کرتی ہوتی ہے کہ صبح کے نقیب مرغانِ سحر اٹھتے ہیں اور انہیں اٹھاتے ہیں۔ غریب محنت پسند لوگ تازہ دم اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ جھونپڑوں

سے باہر نکلے، آسمان کو دیکھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے۔ افق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی۔ جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آتی ہے۔ کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا۔ جن پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر انہیں بیخود کرنے کو تھا کہ انہوں نے اپنے دن کے کام کو یاد کیا۔ آگے بڑھے اور رات کی دبی ہوئی آگ پر گری پڑی پتیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ تاپ تاپ کے افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا۔ اس کے بعد پاس کے شکستہ جھونپڑے میں جا کے بیل کھولے اور عین اسوقت جبکہ آفتاب کی سنہری کرنیں مشرقی کنارۂ آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے ہلوں کو کندھوں پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس مسرت اور خوشی کی نظر سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں۔ نظر اس خوشگوار سبزے پر عجب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دور تک پھیلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لیکر آئے ہیں، کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے ہیں۔ رات کا برقع اُٹھا کر آسمان نے اُنہیں اور خوبصورت بنا دیا ہے کیونکہ تاروں کی چھاؤں میں اس وقت اُن کی نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں۔ ایک عالم جواہر ہے جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا کیفیت دکھا رہی ہیں۔ ان جفاکشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا۔ جو اس وقت تو صرف اُن کی نظر ہی کو خوش کرتا ہے مگر اصل میں اُس قدرت کے ہدیے اور نیچر کے تحفے ہر جاندار کو اس کی فیاضیوں

سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتوں پر پہنچ کر اپنی غفلت پر نادم ہو گئے، کیونکہ وہ لوگ
ان سے پیشتر ہی پہنچ چکے تھے۔

یہ سب لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے۔ آفتاب کی کرنوں نے جو امیر
و غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں، کھیتوں کی مینڈوں پر اور کنوؤں کے
کناروں پر ان کا خیر مقدم ادا کیا۔ اب یہ سب لوگ اپنے کام میں اتنے مصروف
ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے۔ اور قدرت کی بہار
بھی ان کی دلفریبی کرنے سے عاجز ہے۔

وہ ہرا ہرا سبزہ زار، وہ سہانا سماں، وہ صبح کی بہار، وہ تر و تازہ ہوا،
وہ اُجلی کرنیں، ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں
سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف
رہتے ہیں کہ ان کی کیفیتوں کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ زمین کی اصل استعداد
کے بڑھانے میں دل و جان سے ساعی ہیں۔ جو صرف ان کے لئے نہیں، تمام دنیا
کے لئے مفید ہے۔ جان توڑ توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ غریب کم قوت بیل جو شاید
رزق رسانیٔ عالم کی فکر میں دُبلے ہو گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی مار کھا کر
ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی محنت آسان
کرنے کے لئے یہ لوگ نہایت درد ناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور انکی
آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے۔ کنوؤں
کے کنارے والے پانی نکال نکال زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں
کو زندہ کر رہے ہیں۔

باقی ان کی بڑی دولت ہے جس کی امید میں وہ آرزومند بن بن کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کوؤں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ آفتاب پوری بلندی پر پہونچکر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جھکتے جھکتے افق مغرب سے قریب پہونچتے وقت باغ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زرد پڑجاتا ہے خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ مگر یہ نہ تھکنے والے اور دُھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی صورت سے اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ نہ محنت انہیں تھکاتی ہے نہ مشقت انہیں ماندہ کرتی ہے، نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں، نہ کام کرنے سے اُکتاتے ہیں۔

الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے، دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دل فریب کیفیتوں کا لطف بخوبی اٹھا کر اس امید پر کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ ترو تازہ پائیں گے، اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں۔ خوش خوش اس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں، جسے ہم نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔ بیوی غریب کا کھانا اور فصل کے مناسب غذا ان کے سامنے لاکر رکھدیتی ہے، یہ تہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کرکے کھاتے ہیں۔ اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کرکے سویرے ہی سے پڑ کر سو رہتے ہیں۔

یہ غور کرو کہ وہ کس لئے اس حیثیت میں پڑتا ہے تو معلوم ہو کہ وہ دنیا کا کتنا بڑا ہمدرد ہے اور حُبِ ملک کس قدر اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے بیشک وہ ساری دنیا کے لئے یہ محنت کرتا ہے اور اس سے زیادہ نوع انسان کا دوست دنیا بھر میں نہ ملیگا ؎

توریت و زبور

(از جناب سید ممتاز علی صاحب مرحوم)

توریت اُن پانچ کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئیں اور زبور حضرت داؤد کی دعاؤں اور مناجاتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ سب کتابیں عبرانی زبان میں تھیں۔ اب ان کے ترجمے ہر زبان میں ملتے ہیں۔ توریت نہایت دلچسپ اور مفید اور دنیا میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اور قرآن مجید کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے عہد قدیم کے انبیاء کے قصے پڑھے ہوں گے انہوں نے دیکھا ہوگا کہ ان قصوں کے بیان کرنے کے دو ڈھنگ ہیں ایک تو نہایت مختصر طریق پر جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے اور ایک وہ حد سے زیادہ مفصل جو ناولانہ پیرایہ میں ان کتابوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ جو قصص الانبیاء کے نام سے لکھی گئی ہیں مگر انبیاء کے پورے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے یہ دونو قسم کے قصے کافی نہیں۔ قرآن مجید کے قصوں کا تو یہ حال ہے کہ حضرت یوسف کے قصے کے سوا جو پورے کا پورا نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ایک جگہ بیان کر دیا گیا ہے اور کسی نبی کا قصہ پورا ایک جگہ نہیں لکھا گیا۔ بلکہ ان قصوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مختلف مقامات میں حسب ضرورت بطور حوالجات بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کا مقصد ان قصوں کے ذکر سے ان انبیاء کے پورے حالات بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم قرآن کی تائید کے لئے کسی نبی کے حالات میں سے جو خاص بات بتانی مطلوب ہوئی وہ بیان

کر دی گئی۔ باقی حصہ چھوڑ دیا گیا۔ مثلاً انسان کی ناشکری کا ذکر کرتے ہوئے
کسی نبی کی امت کا ذکر کر دیا گیا کہ ہم نے ان لوگوں پر بھی ایسی مہربانیاں کیں
مگر انہوں نے یوں ناشکری کی۔ مثلاً آنحضرت اہل مدینہ کو جہاد کے لئے آمادہ
کرتے تھے۔ مگر وہ جہاد کے لئے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اور طرح طرح کے بہانے
بناتے تھے۔ تو اس پر بنی اسرائیل کا کوئی قصہ اسی قسم کا بیان کر دیا گیا کہ وہ بھی اسی
قسم کے بہانے بنایا کرتے تھے۔

پس قرآن مجید میں تو نبیوں کے حالات کے اس قدر مختصر سے ٹکڑے دیئے
گئے ہیں کہ ان سب کو ملانے سے بھی پورے حالات نہیں بن سکتے۔ رہے کتابی
قصے، وہ بالکل بے سر و پا اور بے سند ایک قسم کے مذہبی ناول ہیں۔ جو مسلمانوں
نے یہودیوں سے سن سنا کر بے تحقیق لکھ دیئے۔ انبیاء کے پورے صحیح حالات معلوم
کرنے ہوں۔ اور قرآن مجید کے قصوں سے پورا لطف اُٹھانا ہو، تو توریت کو
ضرور پڑھنا چاہیئے۔ جو تمام قرآنی قصوں کا مخزن ہے۔

معلوم نہیں کہ مسلمانوں کو ان کتب مقدسہ کے پڑھنے کی طرف بے رغبتی اور
بے توجہی کیوں ہے۔ بے توجہی ہی نہیں۔ بلکہ اس قسم کا احتراز ہے کہ گویا ان کا مطالعہ
گناہ ہے۔ اس احتراز کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں منسوخ ہو گئی ہیں اس لئے اب ان کا پڑھنا
محض فضول ہے۔

دوم۔ ہمارے علماء قرآن مجید کے بعض الفاظ کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ان
کتابوں میں تحریف ہو گئی ہے یعنی یہ کتابیں اپنی اصلی صحت پر نہیں رہیں جس طرح

نازل ہوئی تھیں بلکہ ان میں بہت کچھ ادل بدل ہوگیا ہے جس سے ان کے
پڑھنے سے گمراہی کا اندیشہ ہے۔

منسوخی کے باب میں یہ بات تو صحیح ہے کہ توریت کے چند سے احکام قرآن
مجید کے نازل ہونے سے بدل گئے مگر یہ توریت کا ایسا قلیل حصہ ہے کہ شمار
میں آنے کے قابل نہیں۔ موسیٰ کی پانچوں کتابیں جنہیں توریت کہتے ہیں اور
دوسرے انبیاء کے صحیفے خالص تاریخی کتابیں ہیں جو حالات و واقعات سے پُر
ہیں۔ یہ واقعات منسوخ کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ زبور میں بھی جو
دعاؤں اور مناجاتوں کا مجموعہ ہے کوئی چیز منسوخ ہونے کے قابل نہیں پس
اول تو منسوخی کا خیال غلط ہے اور اگر چند احکام کی تبدیلی کی وجہ سے کل ضخیم مجموعہ
کو منسوخ کہہ بھی دیا جائے۔ تو اس کا نتیجہ صرف اتنا ہونا چاہئے تھا کہ توریت کے
احکام کی طرف توجہ نہ کی جاتی لیکن باقی تاریخی حالات کا ضرور مطالعہ کیا جاتا۔
کیونکہ نسخ کو ان حالات میں کیا دخل ہو سکتا ہے؟

علاوہ ازیں ہمارے اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیثوں میں
بعض حصے منسوخ ہیں۔ مثلاً سورۂ کافرون کو جس میں اللہ تعالیٰ نے "لکم دینکم
ولی دین" کہہ کر سب لوگوں کو دین کی آزادی عطا فرمائی ہے۔ آیت قتال یا
سیف سے منسوخ سمجھتے ہیں۔ لیکن باوجود منسوخ سمجھنے کے قرآن مجید کی تلاوت
کے وقت بلکہ نماز میں بھی سورۂ کافرون کو پڑھتے ہیں، یہ نہیں کرتے کہ توریت
کی طرح منسوخ ہونے کی وجہ سے اسے قابل تلاوت بھی نہ سمجھیں۔

رہی کتب مقدسہ کی تحریف، اگرچہ اس خیال کی بنا قرآن مجید کی ایک آیت

ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ یہودی توریت پڑھتے ہوئے بعض الفاظ میں ردو بدل کر
دیتے ہیں لیکن محققین علماء کا یہ مذہب ہے کہ یہودی آنحضرت صلعم کو توریت کی
عبرانی عبارت غلط پڑھکر سنا دیا کرتے تھے۔ اور ویسا ہی اپنے مطلب کے موافق
اس کا ترجمہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ساری کتاب میں تحریف
ہوگئی اور وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔

یہ سچ ہے کہ زمانۂ قدیم میں کتابیں چھاپنے کا فن نہیں تھا اور توریت سی ضخیم
کتابوں کا لکھنا آسان کام نہ تھا۔ اور آئے دن جو آفتیں اور حادثے قدیم قوموں
کو پیش آتے رہتے تھے ان میں ان کتابوں کا بالکل محفوظ رہنا مشکل تھا۔ اور یہ
بات ثابت بھی ہے کہ بہت جگہ ان کتابوں میں تبدیلیاں اور غلطیاں ہوگئیں لیکن
ہم جو مسلمانوں کو ان کتابوں کے پڑھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو نہ اس خیال
سے کہ ان کا پڑھنا ثواب ہے۔ نہ اس خیال سے کہ ان کتابوں سے فقہی احکام اخذ
کرتے ہیں اور ہر لفظ کی صحت پر بحث کرتے ہیں بلکہ محض اس لئے توجہ دلاتے ہیں
۔ وہ دنیا میں سب سے پہلی آسمانی کتاب ہے اور اس میں آفرینش عالم کی تاریخ درج ہے
اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الہامی دنیا میں آدم کے وقت سے ہمارے پیغمبر صلعم کے
زمانے تک کیا کیا ہو گذرا ہے۔

دوم۔ ان کتابوں کے پڑھنے کی ہم اس لئے سفارش کرتے ہیں کہ ان کو
پڑھے بغیر ہم قرآن مجید کے قصے پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ گویا توریت اور
زبور ایک طرح قرآن مجید کیلئے تفسیر کا کام دیتی ہیں۔

یہ کہلایا جاتا ہے کہ میرا ایمان ہے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر اور اُنکی کتابوں پر اور پھر قرآن مجید میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تجھ سے پہلے انبیا پر نازل کی گئیں اور یہ بھی فرمایا گیا کہ توریت میں ہدایت اور نور اور رحمت ہے۔ اس لئے ان کتابوں کا پڑھنا میری رائے میں تو قرآن مجید کی تفسیر کے علاوہ اور طرح بھی موجب رحمت ہو۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ اگرچہ اصولاً یکساں توریت و انجیل اور سب صحیفوں کے متعلق متصور ہو سکتا ہے۔ مگر میری ذاتی سفارش انجیل سے نہیں بلکہ صرف توریت و زبور و دیگر صحف انبیا سے ہے۔ جو اپنے مضامین اور طرز بیان میں قرآن مجید سے بہت ملتے جلتے اور اس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انجیل کے متعلق میں اپنے خیالات کسی دوسرے وقت ظاہر کروں گا۔

کتب کا مطالعہ

(از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی)

مطالعہ تنہائی اور عزلت میں خوشی بخشتا ہے، گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا ہے، معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ پس مطالعہ سے خوشی، حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات اور مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام صلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہیئے اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے۔ اور ان کی باتوں

کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو عین اور تسلیم کریں گے۔ باہم خود بہت سی
باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصد اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتیں تولینگے
اور سوچیں گے، پھر جو عمل کرنے کے قابل ہونگی، اُن پر عمل کریں گے۔ بعض
کتابوں کا صرف مزا چکھا جاتا ہے یعنی اُن میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل
نگلی جاتی ہیں یعنی کل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت
تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کر ہضم کی جاتی ہیں یعنی اول سے آخر تک پُوری
توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں
بنتی ہیں اُن کا حال آب مقطر کا سا ہے۔

آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے۔ اس سے تقریر شستہ اور تحریر چست
و درست ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار بنا دیتا ہے
نظم کا طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے علوم ریاضیہ طبیعت کو ذکی بناتا ہے۔
اور علوم طبعیہ ذہانت کو عمیق، علم اخلاق کا سنجیدہ و متین، منطق، علم بلاغت
و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ غرض مطالعہ کا اثر ضرور
انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے۔

انسان کے امراض جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں، ایسے ہی امراض
ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ سینہ و شش کا علاج شکار۔ معدے کا
علاج سیج سیج قدم قدم چلنا۔ دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا علیٰ
ہذالقیاس اور علاج ہیں۔ اسی طرح اگر ذہن میں آوارگی و پریشانی ہو تو
علوم ریاضیہ کا مطالعہ اس کا علاج ہے جو اس کے ذہن کی پریشانی کھو دے گا

اگر ذہن بے تمیز ہے کہ وہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا تو حکمت اور فلسفہ اس کا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت میں دوسری بات کی توضیح نہیں کر سکتا تو قانون دانوں کے فیصلہ جات کا پڑھنا اس کی دوا ہے۔ غرض امراض ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔

مطالعہ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبار زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے۔ جو مطالعہ کتب ہمارے کاروباری زندگی میں کام نہیں آتا۔ اس کو بھی بیکار نہ جانو۔ کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کو درست کرتا ہے مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنوں کے استعمال کو سکھاتا ہے۔

دانشمندوں کے کلام کے مطالعہ پر جو نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کریگا تو ابتدا میں مسرت حاصل ہوگی پھر دانائی کے ساتھ مواصلت۔

کسی مطالعے سے مضرت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر مطالعے کے ساتھ مسرت ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہنچتی ہے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے اور پیشے والوں کی۔ اس مشاہدے کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے۔ اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارت جسمانی کو معتدل ورزش جسمانی سے کم کرتا رہے۔ اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے۔

آدمی اپنا وقت کاٹنے کے لئے حقہ پیتے ہیں، ہلاس سونگھتے ہیں، اور ان سے

مسرور ہوتے ہیں۔ اب اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو لوگ کسی فن یا علم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کا وقت کیسا خوشی سے گذرتا ہوگا۔ ابتدا ایں جو اس کے اندر کچھ محنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ آگے جاکر مطالعہ کرنے والے کے لئے تفریح طبیعت ہوجاتی ہے۔

جب آسمان پر چاند کا چاندی کا لیمپ روشن ہو، تو یہ وقت تیرے مطالعہ کے لئے اچھا ہے کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے، اور تو اس میں باریک اور تاریک معانی کو دیکھے اور چاند اور ستاروں کی سحر کاری کو سمجھے۔

نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے۔ جیسے جسم کے واسطے ورزش، ورزش جسمانی سے جسمانی تنومندی حاصل ہوتی ہے۔ مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے۔ ورزش سے جو خاص جسم کی تناوری کے لئے کی جائے۔ کچھ تکان ہوتی ہے، اسی طرح مطالعہ سے بھی جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جائے۔ کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ مگر جب کبھی پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے، تو اس کی تکلیف اور تکان کی پرواہ نہیں ہوتی۔ شکار کھیلنے سے مسرت و صحت ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی محنت راحت معلوم ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی تمثیلات اور نقل و حکایات کے نصائح کے مطالعے سے انبساط و صحت روحانی حاصل ہوتی ہے اور اسکی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعہ میں رکھتے ہیں جن کا بہت سا حصّہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون اُن کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوشی کے مارے اُچھل پڑتے ہیں اور

وں میں چھوٹے نہیں ہو جاتے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں
ں تو کیا آئی۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس

(از سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ)

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا ملتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منھ سے جھاگ نکل پڑتی ہے اور ایک آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ جاتے۔ اُس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اُس کی کمر میں، اُس کا کان اُس کے منہ میں، اور اُس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں، اُس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا، دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں، یوں ہے، کہتا ہے.... واہ تم کیا جانو، وہ جواب دیتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدلجاتی

ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہوجاتی ہیں، باچھیں چِر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک نکل پڑتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں سانس جلدی جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، غیف غیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستینیں چڑھا، ہاتھ پھیلا، اُس کی گردن اُس کے ہاتھ میں، اُسکی ڈھاڑھی اُس کی مٹھی میں، لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا۔ تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جسقدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے، اُسی قدر اس تکرار میں کمی آتی جاتی ہے، کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آتی ہے کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذرتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

کامیابی کی دعا

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

یا اللہ کہا جاتا ہے کہ تو ہے، اور کہا جاتا ہے کہ تو نہیں ہے، اور ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا موجود تو ہے مگر اس کو مخلوق کے معاملات میں دخل نہیں ہے۔ کیونکہ ہر چیز کو اس نے ایک قاعدہ کے ماتحت بنا کر اور عمل وسعی کی طاقت دیکر خود مختار اور

زا کر دیا ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کا ہر چیز میں دخل ہے اور جب تک اس کو
. ونہ مانگی جائے کوئی کام پورا نہیں ہوتا ، اوران لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو یہ بیان
رتے ہیں کہ خود خدا نے کہدیا ہے کہ " لیس للانسان الا ما سعیٰ " انسان کے لئے اس دنیا
اں سکی کوشش کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے ، یعنی انسان بغیر اپنی ذاتی سعی و محنت
ے یہاں کچھ حاصل نہیں کر سکتا ۔ اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے خدا
ے کبھی دعا نہیں مانگی ۔ اور ہم خدا کے وجود کو بھی نہیں مانتے ، اور دنیا کی ہر نعمت کو
م نے محض اپنی تدبیر اور عقل و محنت سے حاصل کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنایا ہے
اللہ ! اے میرے یقین و ایمان کے خالق میں ہر بحث سے بے نیاز ہو کر بغیر کسی دلیل کے
ترے موجود ہونے کو مانتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تو نے مجھے آدمی کی صورت میں
پیدا کیا ، عقل دی ، محنت کی قوت عطا فرمائی ، مگر ہر چیز کو اپنے رحم اپنے کرم اور
پنے فضل کے زیر فرمان رکھا اور کہدیا کہ مجھ سے مانگو ، میں تم کو دوں گا ، اور میں
نے تم کو سب کچھ دیا ہے اور یہ کائنات ہی تمہارے لئے بنائی ہے تاکہ تم اس کو برتو
اور اس کے نفع حاصل کرو اور اس کے نقصان سے اپنی زندگی کو بچاؤ ۔

میں تجھ کو اپنی آنکھوں میں دیکھتا ہوں جب کہ میری آنکھیں تیری مخلوق کی
رنگارنگی کو دیکھتی ہیں ۔ اور میں تجھ کو اپنے کانوں میں سنتا ہوں جبکہ تیرے بندہ
تیرے انکار و اقرار کی بحث کرتے ہیں ، میری زبان میں تو بولتا ہے ، میرے ہاتھوں
سے تو لکھتا ہے ۔ اور میرے پاؤں بھی تجھ ہی سے چلتے اور کامیابی حیات کے لئے
جد و جہد کرتے ہیں ۔

میں انسان ہوں تیری مخلوق ، لیکن بصورت مخلوق ، لیکن بصورت مخلوق

تو نے مجھکو مجبور و مطلق بنایا ہے۔ اور بلحاظ عطائے صفات کمال جو تو نے مجھے انسان کے پیکر خاک کو دی ہیں مختار کل ہوں، اور اس موہوم کائنات میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو پہلے انسان کر چکے ہیں، اور وہ سب کچھ بھی کر سکتا ہوں جو پہلے انسانوں سے نہ ہو سکے۔

پس مخلوق مورت ہونے کے اعتبار سے میرا ہر کام تیری امداد چاہتا ہے، اور جب امداد تیرے وعدہ کے موافق مجھے ملجاتی ہے تو میں کامیاب ہوجاتا ہوں نہیں بلکہ تو کامیاب ہوجاتا ہے، کیونکہ میرا وجود تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصل اور حقیقت تو خود تیری ہی ذات ہے۔ میری موہوم اور فانی شکل تجھ سے دعا کرتی ہے کہ تو اپنی صفات کی قوتیں جنس انسان کو دے تاکہ وہ اس رسالہ کے حروف کو شیؤ دنیا کی زندگی کو کامیاب بنانے میں خرچ کرے، میں اپنے وجود میں اور ہر آدمی کے پیکر میں تیری صفات کے لازوال خزانے موجود پاتا ہوں۔ مگر وہ بے خبری، بے علمی اور بے شعوری کے پردوں میں چھپے رہتے ہیں، یہاں تک کہ انسان اس دنیاوی جسم کو چھوڑ کر عالم ارواح میں چلا جاتا ہے۔

میں تجھ سے اے قدرت و حکمت و عقل کی ابتداء و انتہا دعا کرتا ہوں کہ تو میرے الفاظ کی تاثیر میں، اور میری زبان قلم کو اپنی زبان قلم کی قدرت عطا کر تاکہ میں سب انسانوں کے وہ پردے اٹھادوں جن سے ان کی زندگیاں ناکام ہو رہی ہیں، اور جن کے اٹھ جانے سے وہ خبرداری اور علمیت اور شعور کامل کے ساتھ اپنے جسم کی قوتوں سے آگاہ ہوں اور ان سے کام لینا سیکھیں، ناکام آدمی بھی تیرے بندے ہیں۔ اور کامیاب بھی تیری مخلوق ہیں، جن کی زبان پر تیرا

اقرار ہے وہ بھی تیرے ہی حلقۂ گیسو کے اسیر ہیں اور جو تیری ہستی کے منکر ہیں ان کو بھی تیری ہمہ گیر گرفت سے آزادی میسر نہیں ہے، ہم ہندوستانی انسانوں اور ان میں بھی مسلمان انسانوں کو کامیابی کے عمل اور کامیابی کی جدوجہد اور کامیابی کی حکمت و عقل کا بلاوا دینے اور ان کو علمی عملی، اور کامیاب انسان بنانے کے لئے اس رسالہ کی تیرا نام لیکر شروعات کرتا ہوں، میری یہ دعا قبول ہوگی کیونکہ میں نے اپنے یقین قلب کو باہر نمودار کیا اور جامۂ عمل پہنا کر رسالہ کامیابی کے شروع میں دکھا دیا اور یہی عمل آئندہ رفتار کی کامیابی اور عملیت کی دلیل ہے ؛

شعر و شاعری

(از مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ)

شعر و شاعری کا خبط اسوقت عام طور سے مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مشاعروں میں غزل کی ایک طرح مقرر کی جاتی ہے اور اسپر بہت سے لوگ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان غزلوں میں وہی خیالات اور جذبات بھرے جاتے ہیں۔ جو غدر سے پہلے غزلوں میں بھرے جاتے تھے، وہی عاشقانہ شاعری ہے وہی زہریلے جذبات ہیں جنہوں نے مدتوں سے قوم کے جسم کو مسموم کر رکھا ہے۔ یہ زہریلے جذبات اور مضر خیالات نوجوانوں کی زندگی کو برباد کرنے والے ہیں۔ ہزاروں زندگیاں اب سے پہلے برباد ہو چکی ہیں، اور ہزاروں اب برباد ہو رہی ہیں۔ کیا یہ قومی گناہ نہیں ہے؟ ایسے وقت میں، جبکہ ایک قوم دوسری قوم سے برسر جنگ ہے اور اب زندگی اور موت کا سوال تمام مسلمانوں کے سامنے درپیش ہے کیا ایسی مسموم شاعری

پھیلانے والے قومی مجرم نہیں ہیں؟ اگر وہ ذرا تنہائی میں بیٹھکر اپنے نفسوں کا محاسبہ کریں تو ان کو اپنے گریبانوں میں منہ ڈالنا پڑیگا۔ وہ اپنے ضمیر اور وجدان کو ساری قوم کے سامنے جواب دہ یقین کریں گے۔ پھر وہ ساعت آخر کب آئیگی جبکہ ہماری قوم کے اہم شاعر اپنے افسردہ کن اور مُردنی پھیلانے والی شاعری سے باز آئیں گے؟ ترکوں میں **نامق کمال** پیدا ہوا جس نے اپنی ولولہ انگیز شاعری سے ساری قوم کو زندہ کر دیا، تمام ترک مصائب کا مقابلہ کرنے کیلئے سینہ تان کر کھڑے ہوگئے۔ اگرچہ صدیوں کی جنگ میں اس قوم کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے مگر ہر فرد سارے یورپ کا مقابلہ کرنے کے لئے کوہ البرز کی طرح کھڑا ہوگیا ہے، جب تک اُن کا ایک فرد بھی زندہ ہے اور جبتک کہ اس فرد کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، وہ اپنے ہتھیار ڈالنے اور غلامی قبول کرنے کے لئے طیار نہیں ہے، **زندہ باد نامق کمال!!!**

ہماری مردہ اور افسردہ قوم میں حالی جیسا شاعر پیدا ہوا، جس کے دردناک جذبات کی گونج ابتک ہواؤں میں باقی ہے۔ مگر ترکوں کی طرح ہندوستان کے مسلمان دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے اور زندہ رہنے کے لئے طیار نہیں ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کی طرح صدیوں کی مصیبتوں اور تباہیوں کے بعد جاگنا ہوگا یا وہ عنقریب جاگ اُٹھیں گے۔

حصۂ اول ختم شد

شمشیر ہلال
لطیفہ خانم اور مصطفیٰ کمال پاشا کی داستان عشق
قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول
تیغ بنگالہ